فسانہ

بہترین کہانیاں

فسانہ

شبِ غم کی دوسرا سال

شرحِ چندہ
سالانہ دس روپیہ
عام شمارہ ایک روپیہ
خاص شمارہ ڈیڑھ روپیہ

رہنما
بلونت سنگھ

مدیر
مسعود احمد

خطاط
سیّد احمد حسین

فسانہ میں شائع ہونے والے تمام ادبی یا نیم ادبی مواد میں نام، مقام، واقعات اور ادارے قطعی فرضی ہوتے ہیں اور حقیقی افراد، مقامات، واقعات، یا اداروں سے ان کی کوئی مطابقت محض اتفاقیہ ہے جس کے لئے ایڈیٹر، پبلشر یا مصنف پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی ——

دفتر فسانہ
۲۱۶ - دائرہ شاہ اجمل - الہ آباد ۳

ناظم :- عبد القدوس رومی
طابع و ناشر :- مسعود احمد
مطبوعہ :- اسرار کریمی پریس الہ آباد
ٹائیٹل :- بھارگو پریس الہ آباد



صنم کدہ کی اوّلین پیشکش

بہو بیگم

ستارے

مینا کماری
اشوک کمار
پردیپ کمار

سرزمین اودھ کی حویلیوں کی داستان جن کے دروازوں پر کبھی ہاتھی جھولتے تھے اور نوبت بجا کرتی تھی ــــ لیکن آج گردش زمانہ کے ہاتھوں اُن کے در و دیوار مسمار ہو چکے ہیں اور عظیم کھنڈروں سے حسرت برس رہی ہے۔

- ہدایت :۔ ایم صادق
- نغمے :۔ ساحر
- موسیقی :۔ روشن
- کہانی :۔ جاں نثار اختر
- عکاسی :۔ نریمان ایرانی

ایسٹمین کلر میں


ایک بات یاد رکھیئے کہ
نورانی تیل رجسٹرڈ
دورِ حاضر کی بہترین ایجاد ہے
جس کی ضرورت ہر وقت پڑتی ہے
درد۔ زخم۔ چوٹ کٹنے جلنے اور
طاقت کی مشہور دوا ہے
انڈین کیمیکل کمپنی مئوناتھ بھنجن یو۔پی
NOORANI
TEL
نورانی تیل
नूरानी तैल
INDIAN
CHEMICAL Co.

فہرست

اداریہ

گذشتہ چند مہینوں میں ہمیں کن مشکلات سے گذرنا پڑا اور کن کن دشواریوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ہم "فسانہ" کو جاری رکھنے میں کامیاب ہو سکے یہ باتیں قابل بیان تو نہیں لیکن لائق شکر ضرور ہیں۔

"فسانہ" کا تازہ شمارہ پیش خدمت ہے۔ اس کی ساری ہی کہانیاں مستحق مطالعہ ہیں۔ بالخصوص جناب اختر محی الدین کی کشمیری کہانی "احساسِ حسن" اس کہانی کا خوبصورت انداز بیان اردو پڑھنے والوں کو بہت دنوں تک یاد رہے گا۔

مسعود مفتی کی طویل کہانی "لمحہ" ایک مشرقی ادیب کے قلم سے مغربی ماحول کے بارے میں ایک بہت ہی حسین تخلیق ہے۔ امید ہے فسانہ پڑھنے والے اسے ضرور پسند کرینگے۔

واجدہ تبسم کی اردو کہانی "عیدی" اور شانتی مہروترہ کی ہندی کہانی "بیٹے کی واپسی" خصوصی مطالعہ کی مستحق ہیں۔

جناب انور جلال کا لکھا ہوا فکاہیہ "جینیس کے دوست" طنز و مزاح پسند کرنے والے قارئین شاید کبھی نہ بھول سکیں۔

مدیر


بہارِ نو
بہار نو ٹانک بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے
اور دانت نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
انگوری
معدہ، جگر اور تمام اعضاء رئیسہ اور گردوں کی کمزوری
کو دور کرتی ہے، انگوری میں انگور کے علاوہ اور
بہترین ادویات سے اس کی قوت میں اضافہ کیا گیا ہے
ہر موسم اور ہر عمر کے لئے مفید اور صحت بخش ہے
شربت
نزلہ
معمولی بخار۔ کھانسی
زکام۔ نزلہ کے لئے
فواکہین
تازہ پھلوں کے رس سے تیار
کی جاتی ہے۔ جس کے استعمال
سے معدہ، جگر، اور گردوں
کا فعل بہت بہتر ہو جاتا ہے۔
اور اس میں قوت آجاتی ہے۔
صالح خون کی بہتر تولید میں اضافہ
کرتی ہے۔ دل کو قوت پہنچاتی ہے۔
ریاح کی تولید کو کم کرتی ہے اختلاجِ قلب
کی تکلیف اور خون کے دباؤ کی زیادتی کو
دور کرتی ہے۔
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
TIBBIYA COLLEGE
ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج۔ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڈھ یو۔پی

ناول

پہلا اور آخری خط

قاضی عبدالستار

قیمت ۳/۷۵

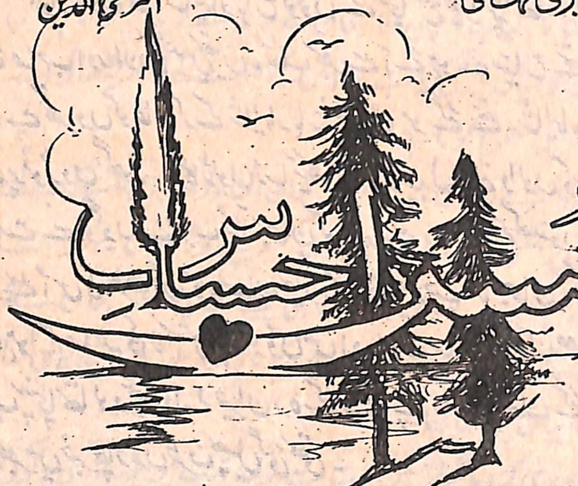
تقسیم کار

"مکتبہ فسانہ"

۲۱۶ دائرہ شاہ اجمل الہ آباد

ایک کشمیری کہانی

اختر محی الدین



مُلّا سبحان ابھی تک سمجھ نہیں سکا تھا کہ حقیقت کیا ہے لیکن اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ میم صاحبہ کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ ضرور ہے۔ یہ بات اس نے پہلی بار اُس وقت محسوس کی تھی جب اس نے میم صاحب کی لاش پہاڑ کے دامن میں اپنے بازوؤں پر اُٹھائی تھی اور خون سے لت پت اس کے ہونٹوں کو چوما تھا۔ اُسی وقت مُلّا سبحان نے پہلی بار اپنے آپ سے کہا تھا: "آج میں بات کی تہہ تک پہنچ پایا ہوں۔" میم صاحبہ کی لاش کو اپنی باہوں کے گھیرے میں لے کر اُس نے دل میں سوچا تھا: "یہ میری شریکِ زندگی ہے.... نہیں یہ میرے بیٹے کی شریکِ حیات ہے.... نہیں.... نہیں... یہ ہم دونوں کی شریکِ زندگی ہے.... نہیں.... نہیں.... نہیں.... آج میں بات کی تہہ تک پہنچ پایا ہوں۔"

مُلّا سبحان تمام چیزیں سمیٹ کر پہاڑ سے نیچے اُتر آیا تھا۔ جس انداز سے وہ میم صاحبہ کے پیچھے پیچھے ایزل بورڈ، برش اور رنگ کندھے پہ اُٹھا کر پہاڑ پر چڑھا تھا بالکل اسی سکون و اطمینان سے وہ یہ تمام چیزیں کندھے پر اُٹھا کر واپس نیچے بھی پہنچا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جاتے وقت میم صاحبہ خود چلتی، دوڑتی اور ہانپتی ہوئی اُس کے ساتھ پہاڑ پر چڑھی تھیں۔ لیکن واپسی میں وہ مردہ حالت میں اُس کے بازوؤں میں تھیں۔ واپسی پر

پہاڑ کے دامن سے مُلّا سبحان نے اس کی لاش اپنی باہوں میں اُٹھائی تھی اور اب شالیمار پہنچ گیا تھا۔

اتوار کا دن تھا۔ شالیمار باغ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا پڑا تھا۔ ولایت سے آئے ہوئے صاحب اور ان کی میمیں تھیں۔ مُلک بھر سے آئے ہوئے سیاح تھے اور کشمیری تو جیسے اپنے گھروں کو خالی کر کے شالیمار باغ میں جمع ہو گئے تھے۔ شالیمار باغ کے باہر سڑک پر موٹروں، گھوڑے گاڑیوں، سائیکلوں اور پیدل چلنے والوں کی دھکم پیل تھی۔ یہاں پر جمع بہت سے لوگوں نے جب مُلّا سبحان کو دُور سے دھان کے کھیتوں سے آتے دیکھا تھا تو پہلے اُس کی طرف اُن کا دھیان نہیں گیا تھا۔ مگر جب مُلّا سبحان آنکھوں سے آنسو برساتا ہوا میم صاحبہ کی لاش بازوؤں میں اور بہت سا سامان کندھوں پہ لئے نزدیک پہنچا تھا تو دیکھنے والے حیران رہ گئے تھے، چلنے والے ٹھٹھک گئے تھے اور۔۔۔ اور لمحہ بھر میں خبر چاروں طرف پھیل گئی تھی۔

دو گورے صاحب آئے، اُنھوں نے مُلّا سبحان سے لاش چھین لی اور اُسے اپنی موٹر میں رکھ دیا اور مُلّا سبحان کو پولیس کے حوالے کر کے چل دئے۔

مُلّا سبحان پر مقدمہ چلا۔ اُس نے اپنی طرف سے کوئی صفائی نہیں پیش کی۔ وہ صرف اتنا کہتا رہا۔ "اب میں بات کی تہہ تک پہنچ پایا ہوں"۔

اس نے جج سے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں بھی یہی بات کہی۔ وہ چاہتا تھا کہ جس طرح اس نے خود ایک اشارے سے بنیادی حقیقت کو پہچان لیا ہے اُسی طرح جج بھی پہچان لے۔ لیکن جج کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ اِدھر مُلّا سبحان کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ جن کی مدد سے وہ جج کو سمجھاتا کہ بات کیا تھی اور وہ اُس کی تہہ تک کیسے پہنچ پایا۔

آخر مُلّا سبحان کو شروع سے آخر تک سارے واقعات سنانے پڑے۔ لیکن جب وہ سُنا چکا تو عدالت میں جج لوگ کچھ اس انداز سے مُسکرائے جیسے مُلّا سبحان کی ساری داستان من گھڑت اور جھوٹ تھی۔ ایک گورے صاحب نے جج سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ مُلّا سبحان جھوٹ بول رہا ہے۔ میم صاحبہ کو اسی نے قتل کر دیا ہے۔

مگر مُلّا سبحان کا بیان سُن کر جج سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے سوال اُبھرے۔ کیا مُلّا سبحان نے میم صاحبہ پر مجرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کی تھی؟ کہ

اُس نے اپنی آبرو بچانے کی خاطر پہاڑ سے چھلانگ لگا کر اپنی جان دے دی تھی؟ مگر مُلّا سبحان تو کافی بوڑھا تھا۔ عمر کے اسّی برس پار کر چکا تھا۔ کیا مُلّا سبحان نے میم صاحبہ کی دولت ہڑپ لینے کے لیے ایسا کام کیا ہے؟ لیکن مُلّا سبحان کے بیان سے تو یہ بالکل ظاہر نہیں ہوتا۔ تو کیا مُلّا سبحان کا بیان واقعی سچ ہے؟ اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ اور بتانے کے انداز سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔

معائنہ کے بعد ڈاکٹر نے رپورٹ دی تھی کہ مُلّا سبحان اتنا بوڑھا ہو چکا ہے کہ اب اُسے عورت کی ضرورت نہیں پڑ سکتی۔ میم صاحبہ کے ماں باپ کشمیر پہنچے تو اُنھوں نے عدالت کے سامنے بیان دیا کہ میم صاحبہ کے پاس بس اتنے ہی پیسے تھے جتنے مُلّا سبحان نے عدالت کی روبرو پیش کئے ہیں۔ طرح طرح کی جرح کے باوجود مُلّا سبحان نے وہی کہا جو اس نے اپنے پہلے بیان میں کہا تھا۔

مُلّا سبحان کو بری کر دیا گیا۔ لیکن بہت سے لوگ شک میں پڑ گئے۔ کئی لوگوں کا خیال تھا کہ میم صاحبہ پاگل ہو گئی تھیں۔ بعض لوگ کہہ رہے تھے کہ مُلّا سبحان بہت ہوشیار آدمی ہے، نہ معلوم کس نیت سے میم صاحبہ کو مار دیا ہے۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ شالیمار پہاڑ پر پریوں کا مسکن ہے۔ میم صاحبہ کو اُنھیں کی نظر کھا گئی ہے۔ مگر مُلّا سبحان اپنی ہی کہتا جا رہا تھا۔ وہ کسی کے کہنے کی طرف دھیان نہیں دے رہا تھا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ میم صاحبہ کا اُس کے بیٹے رمضان کے ساتھ اور رمضان کے وسیلے سے خود اُس کے ساتھ کوئی رشتہ ضرور ہے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ درحقیقت میم صاحبہ رمضان اور وہ خود سب ایک ہیں یا وہ ایک دوسرے کے بچے ہیں .... یا ایک دوسرے کے محبوب ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ مُلّا سبحان اب صبح سویرے بستر سے اُٹھ کر پہلے پچھم کی طرف اونچے پہاڑوں کے اوپر اور نیلے آسمان کے نیچے بادلوں کے جھنڈ پر ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا اور مسکراتا تھا۔ اس کے بعد ڈل جھیل کی سطح پر اور کنول کے پتّوں پر بکھری پانی کی بوندوں پر اپنی نظریں ساکت کر دیتا۔ وہ ایک بوند کو کبھی دو میں بانٹتا اور کبھی دو کو ملا کر پھر ایک بنا دیتا۔ جب کبھی اچانک کوئی بوند کنول کے پتّوں سے لُڑھک کر جھیل میں کھو جاتی تو مُلّا سبحان زور سے قہقہے لگاتا اور کہتا — "اب میں بات کی تہہ تک پہنچ پایا ہوں"۔

جو مانجھی صبح کے وقت مُلّا سبحان کو اکیلے میں اپنے آپ ہنستے، مسکراتے کنول کے

بتّوں سے کھیلتے اور آسمان کی طرف نظریں اُٹھا کر بات کرتے دیکھتے تھے وہ اپنے دل میں کہتے "بے چارہ پاگل ہوگیا ہے۔ نہ معلوم ان دونوں باپ بیٹوں پر کون سا عذاب نازل ہوگیا۔ رمضان نے پاگل ہو کر خودکشی کرلی، اب مُلّا سبحان کا خدا جانے کیا انجام ہوگا؟"

"ایچ۔ بی۔ بٹرفلائی" ہاؤس بوٹ اب بھی دلہن کی طرح سجی سجائی تھی۔ اب بھی صاحب لوگ اور میمیں اُس میں ٹھہرنے کے لئے آتے تھے۔ مُلّا سبحان نے اب ایک مُلازم بھی رکھ لیا تھا۔ وہ اس بڑھاپے میں بھی صاحب لوگوں کی خدمت کر کے پیسے کماتا تھا۔ اس پر باقی مانجھی جل بھُن رہے تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ ایک طرف تو یہ پاگل ہوگیا ہے۔ اپنے آپ ہنستا اور باتیں کرتا ہے۔ پانی کی بوندوں اور بادلوں کے جھُنڈ پر نثار ہوا جاتا ہے اور دوسری طرف باقی مانجھیوں کی طرح کام کاج بھی کرتا ہے۔

مُلّا سبحان آج غریب نہیں تھا۔ وہ کبھی غریب نہیں تھا۔ اُس نے ہمیشہ حیثیت کے مطابق آرام کی زندگی بسر کی تھی۔ ہاؤس بوٹ اس کو وراثت میں ملی تھی۔ اس کی شادی اس کے ماں باپ کی زندگی ہی میں ہوگئی تھی۔ اُس کے چار بچّے ہوئے تھے۔ دو بیٹیاں اور دو بیٹے۔ بیٹیوں کی شادی ہوچکی تھی۔ ایک بیٹا سات مہینے کی عمر میں مرچکا تھا لیکن دوسرا بیٹا رمضان جوانی کے دنوں میں اُس سے چھن گیا تھا۔

یہ دوسرے جنگ عظیم کی بات ہے۔ کشمیر میں بہت سے گورے اور میمیں آئے ہوئے تھے۔ سب ہاؤس بوٹ بھرے پڑے تھے اور کسی ہاؤس بوٹ کے باہر "ٹولیٹ" کا منحوس بورڈ نہیں لگا تھا۔ انھیں دنوں رمضان مُلّا سبحان کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا اور فوج میں بھرتی ہوگیا تھا۔ مُلّا سبحان کو رمضان کی اس بات پر بہت افسوس ہوا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ آخر رمضان کو ہو کیا گیا؟ اپنے یہاں خدا نے گھر بیٹھے روزی بھیج دی تھی۔ ہمیں جنگ لڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اور میں نے سُنا ہے کہ جرمنی کے صاحب لوگ پیسہ خرچ کرنا جانتے ہیں۔ اُن کے یہاں آنے سے اور بھی بھلا ہوتا۔

لیکن مُلّا سبحان کے اس خیال کے باوجود رمضان بھاگ گیا تھا۔ اس نے تھوڑی بہت تعلیم حاصل کی تھی اور اب وہ اپنے علم کو تجربہ کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتا تھا۔ وہ ارد گرد کے چار پہاڑی سلسلوں کے درمیان ڈل جھیل میں اپنے آپ کو قیدی سا محسوس کر رہا تھا۔

وہ باہر کی دنیا دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ آخر یہ میمیں اور صاحب لوگ یہاں کیا دیکھنے آتے ہیں؟ ان کے ملکوں میں ریلیں، جہاز، کارخانے، جنگ، بم اور بہت سی چیزیں دیکھنے کی ہوتی ہیں۔ ہمارے یہاں غربت اور افلاس کے سوا اور کیا ہے؟ چاروں طرف پہاڑ اور بیچ میں ڈل جھیل لمبے جاڑے اور سخت سردی۔ دیکھنے کے لائق مشکل سے ایک بازار ہے اور وہ بھی سُونا سُونا۔ رمضان اُن تمام لوگوں لوگوں کو بیوقوف سمجھتا تھا جو اپنا وطن چھوڑ کر یہاں کی غربت دیکھنے کے لئے گرمیوں میں آتے تھے۔ اُس کو سارا کشمیر ایک پنجرہ سا معلوم ہوتا جس میں وہ خود کو ایک پرندے کی طرح قیدی محسوس کرتا تھا۔

رمضان نے جب سے ہوش سنبھالا تھا تب سے وہ کشمیر سے بھاگ کر کہیں دور جانا چاہتا تھا . . . . امرتسر، بمبئی، کلکتہ، لاہور، ولایت یا کہیں اور لیکن رمضان کے پاس کبھی اتنے پیسے نہیں ہوئے کہ وہ کشمیر چھوڑ کر چلا جاتا۔ اب جنگ کی وجہ سے اُسے موقعہ ملا تھا۔ حضوری باغ کے دفتر میں نام لکھوا کر وہ گاڑی میں بیٹھا اور چلا گیا۔

چار سال رمضان گھر سے دُور رہا۔ چار سال تک مُلا سبحان پاگلوں کی طرح اُس کی راہ دیکھتا رہا۔ اکلوتا بیٹا، اُس کی آنکھوں کا نور، ان چار سالوں میں مُلا سبحان کو صرف دو چیزوں نے سہارا دیا ـــــ ایک رمضان کی تصویر نے، جو نہ معلوم کس مُلک سے اُس نے بھیج دی تھی اور دوسرے اس کے کبھی کبھی آنے والے خطوط نے۔ خط میں کوئی خاص بات لکھی نہیں ہوتی تھی۔ "میں خیریت سے اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں آگے حال یہ ہے کہ مادرِ وطن کشمیر جیسی سرزمین میں نے اور کوئی نہیں دیکھی۔ ہر جگہ بربادی اور ویرانی ہے۔" مُلا سبحان کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتی تھیں اور نہ اُس کو یہ باتیں سمجھنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اس کے لئے صرف اتنا ہی کافی تھا کہ رمضان زندہ ہے اور وہ اپنے وطن کشمیر کو بھول نہیں گیا ہے وہ رمضان کی تصویر دیکھ کر خوش ہو جاتا تھا اور اسی لئے اس نے اس کی تصویر کو فریم کر کے "ایچ۔ بی۔ بٹر فلائی" کے ڈرائنگ روم میں سجا دیا تھا۔

آخر چار سال کے بعد جنگ ختم ہوئی اور رمضان کو چھٹی ملی۔ وہ گھر پہنچا۔

اپنی تصویر سے ملتا جلتا رمضان، ولایتی ڈھنگ کے کپڑے پہنے، انگریزوں کی طرح داڑھی منڈائے، لمبا تڑنگا اور کسرتی جسم، لیکن اُس کا رنگ ہلکا سا نولا سا ہو گیا تھا اور نہ معلوم اُس کے دماغ کو کیا ہو گیا تھا۔ مُلّا سبحان کو رمضان کے دماغ کا حال اُس دن تک سمجھ میں نہ آیا تھا جس دن میم صاحبہ نے پہاڑ سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرتے وقت کہا تھا۔

"میں رمضان کو ڈھونڈوں گی . . . میں رمضان کے پاس جاؤں گی"۔

رمضان جب فوج سے چھٹی پا کر کشمیر پہنچا تو اُس کی آنکھوں میں روشنی چمک اُٹھی۔ گرمیاں شروع ہو رہی تھیں۔ وہ بہت خوش تھا اور قہقہے لگاتا تھا۔ اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ کشمیر کی نرم اور گداز سرزمین میں واقعی جان ہے۔ وہ کہتا تھا کہ عراق اور مصر کے ریتیلے میدان بے حس مُردے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ یورپ کی پتھریلی سڑکیں، فیکٹریاں اور ریلیں بے رحم ہیں جیسے مُردہ لوہے نے سارے علاقے کو اپنے ٹھنڈے ہاتھوں میں بھینچ کر مُردہ بنا دیا ہو۔ رمضان فوج سے چھٹی پا کر اب عجیب سی باتیں کرنے لگا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اُن ملکوں کے لوگوں کو لوہے نے ٹھنڈا کر دیا ہے۔ جنگ لڑنا، بستیاں ویران کرنا، گُم ہو جانا اور مرنا کوئی بھی بات اُن کے دل پر اثر نہیں کرتی۔ کوئی سرزمین دوست نہیں، کوئی علاقہ اپنا نہیں۔ میں بھی گُم ہو جاتا، میں بھی مر جاتا۔ لیکن کشمیر کی نرم نرم، گداز گداز زمین ہر وقت میرے ذہن میں رہتی۔ میں اس سرزمین پر ایک بار پھر پاؤں رکھنا چاہتا تھا۔ میری آنکھیں کشمیر کی ہریالی ایک بار پھر دیکھنا چاہتی تھیں۔ میرا دل کشمیر میں تھا اور میرا راستہ یقیناً اسی طرف تھا اسی لئے مجھے کوئی نہ مار سکا اسی لئے میں کہیں بھی گُم نہ ہوا۔

یہ باتیں سُن کر جب سب لوگوں نے کہا کہ رمضان پاگل ہو گیا ہے تو مُلّا سبحان کو بھی لوگوں کے کہنے پر یقین سا آنے لگا۔ وہ آہیں بھرنے لگا اور رمضان کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ پہلے پہل مُلّا سبحان نے رمضان کا دھیان ان سب باتوں کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کی۔ رمضان بیٹھے بیٹھے ڈل جھیل میں کود پڑتا اور تیرتا ہوا دور تک چلا جاتا تھا۔ کبھی وہ جلدی واپس لوٹتا اور کبھی دیر تک تیرتا رہتا تھا۔ کبھی وہ پانی کے نیچے ڈبکی لگا کر غائب ہو جاتا اور کبھی بس یوں ہی ہلکے ہلکے تیرتا جاتا۔ مُلّا سبحان رمضان کا یہ حال دیکھ کر پریشان ہو جاتا اور آخر جب رمضان لوٹ میں

واپس آجاتا تو مُلّا سبحان اُس سے پوچھتا۔ "میرے بیٹے تم کو ہو کیا گیا ہے؟ بچے تو نہیں ہو کہ جھیل میں ننگ دھڑنگ کود پڑو۔"

ایک دن رمضان نے جواب میں کہا تھا۔ "بابا! چھوٹی چھوٹی بہت سی مچھلیاں ایک لمبی قطار میں جا رہی تھیں اور میں بھی انھیں کے ساتھ تیرتا جا رہا تھا۔ اُنھوں نے ایک ساتھ پانی کی تہہ تک ڈُبکی لگا دی تو میں نے بھی لگا دی۔ وہاں پر . . . . . ."
اُس نے اُنگلی اُٹھا کر ایک طرف اشارہ کیا۔ "وہاں سے یہ واپس لوٹ آئیں اور میں بھی لوٹ آیا۔ پھر اُنھوں نے مجھے چکمہ دینے کی کوشش کی۔ پہلے سیدھی قطار میں چلنے لگیں اور پھر یکایک دائیں طرف مڑ گئیں۔ لیکن میں بھی تو ہوشیار ہوں۔ بالکل انھیں کے ساتھ تیرتا اور مڑتا رہا۔" اور یہ کہہ کر اُس نے زور کا قہقہہ لگایا۔

رمضان ہر صبح چھوٹے شکارے میں بیٹھ کر کبوتر خانے کے قریب پہنچ جاتا۔ یہاں بیت کے پیڑوں کا جھرمٹ تھا۔ بیتوں کی شاخیں گھنے پتّوں کے بوجھ سے ٹیڑھی ہو کر پانی کو چھو لیتی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے خوب صورت دوشیزائیں اپنی زلفوں کو پانی میں بھگا کر تر کر رہی ہوں۔ بیت کے پیڑوں کے نیچے سبزہ اپنا مُنہ ڈل کی طرف بڑھا کر پانی پر کرنوں کی پریوں کو چومنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رمضان ہر صبح شکارے میں بیٹھ کر اس جگہ پہنچ جاتا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے ڈل کا پانی بیت کے پیڑوں اور وں سے نکل کر بہہ رہا ہو۔ یہ ڈل نہیں ہے۔ پانی نہیں ہے۔ بلکہ یہ اُس لوک کتھا کی پریاں ہیں جن کے بالوں سے موتی جھڑتے ہیں اور یہ سبزہ اُن پریوں کی یاد دلاتا ہے جو باتیں کرتے وقت مُنہ سے موتی رُولتی رہتی ہیں۔ ڈل کا پانی دراصل موتیوں کا ڈھیر ہے جو کہیں کہیں کمل کے پتّوں پر اپنا اصلی روپ دکھاتے ہیں۔ رمضان کبھی کپڑے اُتار کر اور کبھی کپڑے سمیت ڈل جھیل میں کود کر انھیں موتیوں کو پانے کی کوشش کرتا۔ وہ اپنے آپ کو انھیں موتیوں، اسی سبزہ اور انھیں صبح کی کرنوں میں کھو دینا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سارے طلسم کا ایک حصّہ بن جائے۔
اور رمضان کی یہ حرکتیں دیکھ کر لوگ کہتے تھے کہ رمضان پاگل ہو گیا ہے۔ مُلّا سبحان کو بھی یقین آنے لگا تھا کہ وہ پاگل ہو گیا ہے۔ اس لیے مُلّا سبحان اس کے لیے تعویذ گنڈے لاتا تھا۔

لیکن رمضان کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے اس نے کوئی کھوئی ہوئی چیز پھر سے پالی ہے۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ باقی لوگوں کو اس حسن کا احساس کیوں نہیں ہوتا۔ اُس نے کئی بار مُلّا سبحان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "دیکھیے بابا!" اس نے ایک دن کہا تھا" وہ وہ بادل کا ٹکڑا جیسے میری روح آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی ہے۔ بابا... بابا... گیا ہر مُکھ پہاڑ کے سر پر سونے کی پگڑی بندھی ہوئی ہے؟ نہیں.... نہ کہنا بابا!"

مگر مُلّا سبحان اُن دنوں یہ باتیں نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اسی لئے رمضان نے اُس کے ساتھ بات کرنا چھوڑ دیا تھا۔ رمضان اب اس سے پہاڑوں، بادلوں، پانی اور بیت کے پیڑوں کی باتیں نہیں کرتا تھا۔ رمضان اب اِن چیزوں کی باتیں خود اپنے آپ سے کیا کرتا تھا۔ وہ صرف کبھی کبھی نا اُمید ہو کر اپنے باپ سے کہتا...."بابا میرا کلیجا پھٹا جا رہا ہے۔ میں آپ کو سمجھاتا مگر میرے پاس الفاظ نہیں ہیں بابا... وہ دیکھیے...." اور یہ کہہ کر وہ یکایک خاموش ہو جاتا اور سر جھکا کر کشتی کے باہر والے سرے کی طرف چلا جاتا۔

اور پھر لوگوں نے کہا کہ رمضان پوری طرح پاگل ہو چکا ہے۔ مُلّا سبحان اب نہیں مانتا کہ اُس کا بیٹا پاگل ہو گیا تھا۔ اب وہ کسی بات کی تہہ کو پا چکا تھا۔ لیکن اس کے ماننے نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لوگوں نے خود دیکھا تھا کہ رمضان پاگل ہو گیا ہے۔ وہ اب سیاحوں اور صاحب لوگوں کے پاس نہیں جاتا تھا۔ اُن کی خدمت کر کے پیسہ کمانے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا۔ وہ صرف اپنی کشتی کے اگلے سرے پر بیٹھ کر کنول کے پتوں پہ پانی کی بوندوں کی طرف دیکھتا تھا۔ وہ صبح سے شام تک انھیں پر نظریں جمائے بیٹھا رہتا۔ کبھی کبھی وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا تھا۔ "یہ موتی کہاں سے آتے ہیں، ان کو سبز پلیٹوں پر کس نے چن رکھا ہے؟ کاش سب لوگوں کو ان کی پہچان ہوتی۔"

اسی حالت میں گرمیوں کا موسم گزر چکا تھا اور اب خزاں بھی ختم ہونے کو تھی۔ فطرت نے طرح طرح کے رنگ بدلے اور ہر رنگ رمضان کے لئے نئی نئی خوشیاں لے کر آتا تھا۔ آخر جاڑا آ گیا۔ جاڑا جو مُردہ ہے۔ جس نے کنول کے پتّوں کو مُرجھا دیا۔

جس کی وجہ سے پریوں بیت کی پریوں کی زلفیں اُجڑ گئیں، سبزہ مر گیا اور ہر طرف ویرانی ہی ویرانی پھیل گئی۔ رمضان کے دیکھتے دیکھتے یہ سب کچھ ہو گیا، اس کے سامنے سے اس کی کوئی بہت پیاری چیز اُوجھل ہو کر کھو گئی۔ اُس نے ایک دن مُلّا سبحان سے کہا ـــ

"بابا وہ کیا ہوا ؟ . . . . وہ پانی . . . . . وہ سبزہ . . . . ."

مُلّا سبحان نے محسوس کیا کہ رمضان بخار سے تپ رہا ہے۔ اس نے بڑے نرم اور پیار بھرے انداز میں رمضان سے کہا (جیسے رمضان پانچ برس کا بچہ ہو) "بیٹا جاڑا ختم ہو جائے تو بہاریں یہ سب چیزیں پھر سے لوٹ کر آئیں گی۔"

"میں کتنی دیر انتظار کرتا رہوں !" رمضان نے اس انداز سے کہا جس طرح کوئی بچہ اس امید پر ڈاکٹر کا انتظار کرتا ہے کہ وہ آئے اور اس کو دل پسند کھانا کھانے کی اجازت دے دے۔

مُلّا سبحان خاموش رہا۔ بہت دیر تک وہ خاموش بیٹھا رہا مگر رمضان نے خود بات چھیڑ دی، اُس نے کہا "جاڑا بہت بے رحم ہے بابا !" اور اس کے بعد رمضان نے کچھ ایسی باتیں کہیں جنھیں سُن کر مُلّا سبحان کے مُنہ پر غم کی سیاہی پھیل گئی۔ مُلّا سبحان رمضان کی باتیں نہیں سُننا چاہتا تھا، مگر رمضان کہتا جا رہا تھا۔ آخر میں مُلّا سبحان نے ذرا تیکھے لہجے میں کہا۔ "ایسا نہیں کہتے بیٹا۔ تمہاری عمر ہی کیا ہے ! ابھی تمہیں بہت سی بہاریں دیکھنی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے مُلّا سبحان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اسے یقین ہو گیا کہ رمضان کو کسی کی بُری نظر کھا رہی ہے۔

اور یہ مُلّا سبحان کی رمضان کے ساتھ آخری مُلاقات تھی۔ دوسری صبح جب مُلّا سبحان کی آنکھ کھلی تو اس کی آنکھ کا تارا ڈوب چکا تھا۔ صبح صبح اس نے دیکھا کہ رمضان ڈل جھیل کے برف جیسے پانی میں مرا پڑا ہے۔ مُلّا سبحان کی آنکھ کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس کو رمضان کی وہ سب باتیں یاد آ گئیں جو اس نے کل رات کہی تھیں۔

رمضان کے مرنے پر حالانکہ بہت سے لوگوں کو مُلّا سبحان کے بڑھاپے پر رحم آیا۔ لیکن رمضان کی موت کی خبر ان کے لئے حیرت کی بات نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی سے جانتے تھے کہ ایک دن رمضان خود کو پانی میں ڈبو دے گا۔ لیکن لوگوں کو زیادہ حیرت اس بات پر ہوئی جب مُلّا سبحان نے اُن سے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرے بھائیو!

اسے سلیمان پہاڑی پہ دفن کرنا، قبر پورب کی طرف ہو اور اس کی آنکھیں ڈل جھیل کی طرف رکھی جائیں"۔ یہ سُن کر لوگ حیرت میں پڑ گئے۔ آخر مُلّا سبحان اپنے بیٹے کو قبرستان میں کیوں دفن نہیں کرنا چاہتا تھا؟ وہ ایک ایک کر کے یہ سوال مُلّا سبحان سے پوچھنے لگے، مگر اُس نے کسی سے دل کی بات نہیں کہی۔ یہ ایک راز تھا جو مُلّا سبحان نے کسی سے نہیں کہا۔ اُس نے یہ بھید صرف اس میم صاحبہ کے سامنے کھول دیا تھا جس نے پہاڑی سے چھلانگ لگا کر جان دے دی تھی۔ اور جس کے بارے میں مُلّا سبحان سوچتا تھا کہ وہ اُس کی بیوی تھی.... نہیں اُس کی بہو تھی.... نہیں.... نہیں.... اس کی بیٹی تھی.... نہیں.... نہیں.... وہ اس کی.... .... !

ایچ بی ہٹر فلائی ہاؤس بوٹ جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ اس کے تمام کمروں میں روشنیاں جل رہی تھیں اور 'ٹوئیٹ'، کا منحوس بورڈ جاڑا ختم ہوتے ہی اُٹھ چکا تھا۔ مُلّا سبحان خوش تھا۔ اس کی اس بوٹ میں ایک نو عمر اور معصوم میم صاحبہ ٹھہری تھی۔

یہ میم صاحبہ ایک انگریز کرنل کی بیٹی تھی جو آج سے سترہ سال پہلے اپنی خوبصورت اور نوجوان بیوی کو ساتھ لے کر کشمیر آئے تھے اور یہاں مُلّا سبحان کے ہاؤس بوٹ 'بٹر فلائی' میں دو مہینہ ٹھہرے تھے۔ مُلّا سبحان اور اس کی بیوی نے ان دونوں میاں کی خوب خدمت کی تھی اور دو مہینہ کے ختم ہونے کے بعد جب کرنل اور اس کی بیوی جانے لگے تو انھوں نے مُلّا سبحان کی بیوی کو رمضان کے لئے بہت سے کھلونے دے تھے۔ رمضان ان دنوں تین برس کا بچّہ تھا۔ کرنل کی بیوی اس کو کبھی کبھی اپنے کمرے میں بُلوا کر اپنے ہاتھوں سے کھلاتی پلاتی تھی۔ مُلّا سبحان ہاؤس بوٹ میں یوں تو اس سے پہلے بھی بہت سے وزیٹر ٹھہرے تھے مگر اس کی خط و کتابت صرف کرنل صاحب سے ہی جاری تھی۔ مُلّا سبحان انھیں ہر سال کشمیر آنے کی دعوت دیتا اور ہر سال کرنل صاحب یہی لکھتے کہ فرصت نہیں ہے۔ اس طرح سترہ برس کے عرصے میں ایک دو دفعہ پندرہ بیس دنوں کے لئے کرنل صاحب جب کشمیر آئے تو مُلّا سبحان کے ہاؤس بوٹ میں ہی ٹھہرے تھے۔

مُلّا سبحان کو کرنل کے ایک خط سے معلوم ہو چکا تھا کہ ان کی میم نے ایک بچی

کو جنم دیا ہے لیکن مُلّا سبحان نے اس بچّی کو ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ آج جب یہ میم صاحبہ پہلی بار کشمیر آئیں تو وہ سیدھے مُلّا سبحان کے ہاؤس بوٹ میں پہنچی۔ وہ اپنے باپ کا ایک خط بھی ساتھ لائی تھی۔ اس کے علاوہ کرنل صاحب نے مُلّا سبحان کو الگ ڈاک سے بھی ایک خط بھیج دیا تھا۔

ہاؤس بوٹ میں جس دن سے وزیٹر ٹھہرنے آتے ہیں اسی دن سے مانجھی کے کانوں میں خوشیوں کے باجے بجنے شروع ہو جاتے ہیں۔ مانجھی دل ہی دل میں چھوٹے بیٹے کا ختنہ، بڑی بیٹی کا بیاہ، گود والے بچّہ کا عقیقہ اور پیر دستگیر کا نیاز کرنے لگ جاتا ہے۔ مگر مُلّا سبحان اب نا امید سا ہو چکا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ زندگی کے سارے کام پوری طرح ختم کر چکا ہے اور اب اُسے کچھ کرنا باقی نہیں ہے۔ وہ بیٹیوں کا بیاہ کر چکا تھا، اُس کا جوان بیٹا مر چکا تھا، پیر دستگیر پر سے اُس کا اعتقاد اُٹھ چکا تھا۔ وہ اب زندگی کے آخری دن گن گن کر گزارہ رہا تھا۔

مگر آج جب پندرہ سولہ سال کی یہ نو عمر اور معصوم میم صاحبہ اُس کے ہاؤس بوٹ میں ٹھہرنے کے لئے آئی تو مُلّا سبحان اپنے ملازم پر بھروسہ نہ رکھ سکا۔ وہ خود اس کی خدمت کرنے لگا۔ ایک تو اُس ناطے کہ یہ اُس کے پُرانے مہربان دوست کی بیٹی ہے اور دوسرے یہ سوچ کر کہ میم صاحبہ ابھی بالکل نو عمر ہے اور اس کی رکھوالی مُلّا سبحان ایسا تجربہ کار شخص ہی کر سکتا تھا۔

ہاؤس بوٹ میں قدم رکھتے وقت سے ہی میم صاحبہ ایسی رہنے لگی تھی جیسے اُس نے اپنی پسند کی چیز پہلی بار پائی ہو۔ وہ صبح سویرے اُٹھ کر بوٹ کے اگلے سرے پر ایزل بورڈ سجاتی اور برش سے پہاڑوں کی چوٹیاں، بید کی جھاڑیاں اور ارد گرد کے ٹیلے بنانے بیٹھ جاتی۔ ایسی کئی تصویروں کے اُس نے خود فریم بنائے اور اُن کو ہاؤس بوٹ کے کمروں میں سجا کر رکھ دیا۔ مُلّا سبحان کو میم صاحبہ پر اس وقت بہت غصّہ آیا جب ایک دن میم صاحبہ کے کہنے پر اُسے اپنے بیٹے رمضان کی تصویر ہاؤس بوٹ کے ڈرائنگ روم سے نکالنی پڑی۔ میم صاحبہ نے اُسی جگہ ٹیڑھے میڑھے سفیدوں کی اپنی بنائی ہوئی تصویر سجا کر رکھی۔ مُلّا سبحان چاہتا تھا کہ میم صاحبہ سے پوچھے کہ یہ ٹیڑھے میڑھے درخت اور پہاڑیوں کی چوٹیاں بنانے پر اتنا قیمتی رنگ و روغن ضائع کرنے سے کیا فائدہ

لیکن وہ پوچھ نہیں سکتا تھا کیونکہ میم صاحبہ وزیر تھی۔ مُلّا سبحان نے رمضان کی تصویر اپنی چھوٹی سی کشتی میں ٹانگ دی۔

میم صاحبہ جھگڑالو نہیں تھی۔ اُس نے کبھی کھانے پینے کی چیزوں پر غصّہ نہیں کیا۔ وہ صفائی اور سجاوٹ پر بھی بالکل دھیان نہیں دیتی تھی۔ وہ صبح سے شام تک یا تصویریں بنانے میں منہمک رہتی یا کوئی انگریزی کتاب اونچی آواز سے پڑھنے میں۔ کچھ اس بات سے کہ میم صاحبہ جھگڑالو نہیں ہے اور کچھ اپنے آپ کو بزرگ سمجھنے کی وجہ سے مُلّا سبحان کے حوصلے بڑھ گئے تھے اور اب وہ میم صاحبہ سے بلا جھجک بات چیت کر سکتا تھا۔

میم صاحبہ ولایت کی کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ وہ انگریزی ادب کی طالب علم تھی اور ورڈس ورتھ کی شاعری اُسے بے حد پسند تھی کیونکہ ورڈس ورتھ اپنی شاعری میں پہاڑیوں، ٹیلوں، چراگاہوں، کھیتوں اور گھاس کے میدانوں کی باتیں کرتا تھا اور میم صاحبہ کو اُنھیں چیزوں کی تصویریں بنانے کا شوق تھا۔ میم صاحبہ کا خیال تھا کہ تصویریں بنانے والا جو کام رنگ و روغن سے لیتا ہے وہی کام ورڈس ورتھ نے الفاظ سے لیا ہے۔ مگر مُلّا سبحان میم صاحبہ کی یہ باتیں نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ یہ باتیں سُن کر غم میں ڈوب جاتا، سوچتا تھا کہ کاش آج رمضان زندہ ہوتا تو وہ اِن نزاکتوں کو ضرور سمجھ لیتا۔ وہ ہوتا تو میم صاحبہ کے ساتھ ان چیزوں پر طویل گفتگو کر سکتا تھا۔

ایک دن میم صاحبہ ہاؤس بوٹ کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی کھڑکی سے باہر ڈل جھیل میں کسی چیز کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ مُلّا سبحان نے دوسری کھڑکی سے جھانکا تاکہ یہ جانے کہ میم صاحبہ آخر کس چیز کو اس قدر انہماک سے دیکھ رہی ہے۔ باہر جھیل کا پانی تھا اور پانی کی سطح پر کنول کا ایک پتّہ تیر رہا تھا۔ میم صاحبہ کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ ہاں! ہاں! اسی کنول کے پتّے پر۔ کیونکہ مُلّا سبحان نے ایک لمحہ کے بعد جب دیکھا تو میم صاحبہ کینوس پر یہی کنول کا پتّہ بنا رہی تھی اور اس پر روغن کا ایک نشان اس انداز سے لگا رہی تھی کہ جیسے پانی کی بوند موتی کی طرح کنول کے پتّے پر چمکتی ہے۔ یہ دیکھ کر مُلّا سبحان کو رمضان کی یاد آگئی۔ مُلّا سبحان نے میم صاحبہ سے یکایک پوچھا "آپ یہ کنول کا پتّہ کیوں بنا رہی ہیں؟" میم صاحبہ مسکرائی اور جواب دیا "جب میری بنائی ہوئی یہ تصویر کسی ایسے ملک میں پہنچ جائے گی جہاں کنول کے پتّے اور کنول کے پھول

موتی جیسی پانی کی بوندیں نہیں ہوتیں تو وہاں کے لوگوں میں حُسن کا احساس پیدا ہو جائے گا۔"
مُلّا سبحان ضرور پوچھتا کہ آخر اس سے کیا فائدہ ہوگا مگر میم صاحبہ نے اُس کے پوچھے بغیر ہی کہا تھا۔ "حُسن کا احساس ہی انسان کو انسان بناتا ہے ورنہ انسان اور حیوان میں فرق ہی کیا رہے ؟"
مُلّا سبحان اگرچہ یہ بات سمجھ نہیں سکا تھا پھر بھی اُس نے اقرار میں سر ہلا دیا تھا اور ایک طرف مُنہ کر کے سوچنے لگا تھا "کاش آج رمضان زندہ ہوتا۔ !"
مُلّا سبحان آج بھی کوئی بات سمجھ نہ سکا تھا لیکن رمضان اور اس کے بعد میم صاحبہ کی اچانک موت نے اُسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ کچھ محسوس کر رہا تھا لیکن کیا ؟ یہ بتانے کے لئے اُس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ صرف واقعات کو اپنے ذہن میں دہراتا رہتا تھا اور بس۔ اُسے ہر وقت اتوار کا وہ دن یاد آتا تھا جس دن میم صاحبہ نے اُسے بُلا کر کہا تھا "آج میں نشاط اور شالیمار باغ کی سیر کو جاؤں گی۔ تم میرے ساتھ چلنا۔"
اس دن مُلّا سبحان نے اپنی لمبی سفید داڑھی میں کنگھی کی اور اُجلے دُھلے ہوئے کپڑے پہن لئے تھے۔ اس نے شکارے کو اچھی طرح سجوایا تھا اور شکارہ چلانے کے لئے دو ماجھی بھی مزدوری پر رکھے تھے۔ وہ خود شکارے میں میم صاحبہ کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ ڈل جھیل کی آئینہ کی طرح شفاف سطح پر شکارہ ہچکولے کھاتا جا رہا تھا۔ اور میم صاحبہ ورڈس ورتھ کی نظمیں پڑھتی جا رہی تھی۔ وہ مُلّا سبحان کو کہنی مار مار کر سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ورڈس ورتھ اسی حُسن کا شاعر ہے۔ ورڈس ورتھ نے جن مناظر کی تصویر اپنے الفاظ میں کھینچنے کی کوشش کی ہے وہی نظارے قدرت نے اپنے ہاتھوں سے یہاں بنائے ہیں۔ مُلّا سبحان یہ باتیں سُنتا رہا۔ وہ کبھی اپنے آپ کو بزرگ سمجھ کر میم صاحبہ کی ان شوخیوں پر مسکراتا اور کبھی خود کو گنوار جان کر سوچتا، اے کاش! آج رمضان زندہ ہوتا۔
میم صاحبہ نشاط باغ میں اس طرح چوکڑیاں بھرنے لگی جیسے کوئی ہرنی بڑی مدّت کے بعد قید سے رہائی پا کر جنگل میں واپس پہنچ گئی ہو۔ وہ اِدھر اُدھر گھومی۔ باغ کے بیچوں بیچ ندی میں ٹخنوں پانی میں دُور دُور تک دوڑی۔ اس کی سانس پھول گئی۔

لیکن وہ تھکی نہیں۔ اسی دوڑ دھوپ میں اس نے ایک یہاں ایک وہاں کچھ تصویریں بنائیں۔ کچھ ٹیڑھی میڑھی لکیریں ——

اس کے بعد یہ لوگ شالیمار باغ چلے گئے۔ باغ کے اندر پہنچ کر جیسے میم صاحبہ کی شفاف آنکھوں میں نیند کا خمار چڑھ گیا۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گئی اور خمار بھری آنکھوں سے کبھی بڑے بڑے چناروں دیکھتی رہی اور کبھی سبزے کو ہاتھ کے لمس سے محسوس کرتی رہی۔ چناروں کی قطاروں پر نظریں جمائے رہی اور کبھی سرو کے درختوں کا قد نظروں ہی سے ناپتی رہی ——

چار بجے کا وقت ہو رہا تھا۔ میم صاحبہ نے ایزل اور بورڈ لگوایا اور کینوس پر ایک ایسا منظر کھینچا کہ پہلی بار مُلّا سبحان کو بھی پسند آیا۔ اُس نے سر کو اقرار میں ہلا کر مُنہ سے "ہوں" کہا جیسے میم صاحبہ کو ہُنرمندی کا سرٹیفکیٹ بخش رہا ہو۔ اس کو پہاڑوں کی چوٹیوں کے پیچھے سورج کی نکیلی کرنیں بہت بھائیں۔

یہ تصویر بنا چکنے کے بعد میم صاحبہ باغ سے باہر آئی۔ مُلّا سبحان ایزل بورڈ برش اور باقی سامان کندھے پر اُٹھا کر اُس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ باغ سے باہر سڑک پر میم صاحبہ نے دور دور تک نظریں دوڑائیں، ڈل جھیل کی طرف دیکھا اور ارد گرد پہاڑوں کا جائزہ جائزہ لیا۔ اس کے بعد اُس نے مُلّا سبحان سے کہا۔ "چلو.... چلو.... اُس پہاڑ پر چڑھیں"

مُلّا سبحان کو آج افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے میم صاحبہ کو پہاڑ پر چڑھنے سے روکا کیوں نہیں تھا۔ اُس نے اُس وقت سوچا ضرور تھا کہ پہاڑ پر چڑھنا اچھا نہیں ہے۔ اُس نے یہ بھی سوچا تھا کہ میم صاحبہ اب بہت سی تصویریں بنا چکی ہیں اور آگے تصویر بنانے کے لئے اب پہاڑ پر چڑھنا ٹھیک نہیں رہے گا۔ لیکن وہ زبان سے کچھ بھی نہ بول سکا تھا۔ ایک تو اس لئے کہ وہ آخر کار میم صاحبہ کا نوکر تھا اور دوسرے اس لئے کہ اُس کو میم صاحبہ کی یہ شوخیاں اب بہت پسند آنے لگی تھیں۔

گرمی زوروں پر تھی۔ مُلّا سبحان ہانپ رہا تھا۔ میم صاحبہ کا نارنگی چہرہ آگ کی لپٹوں کی طرح دمک رہا تھا اور ان لپٹوں کے اوپر پسینے کی بوندیں دکھائی پڑ رہی تھیں جیسے کوئی جادوگر آگ پر ننگے پیر چل رہا ہو۔ میم صاحبہ آگے آگے اور مُلّا سبحان

پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ شالیمار باغ کے دوسری طرف انھوں نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ میم صاحبہ نے پہلے ہی پہاڑ کی آدھی بلندی پر ایک چھوٹی سی ہموار زمین دیکھ لی تھی اور اب وہ اُس طرف جا رہی تھی۔ اُس پر پہنچنے کے لئے ذرا ہٹ کر دوسری طرف راستہ لینا پڑتا تھا۔ کیونکہ یہ ہموار زمین اُس جگہ پر تھی جہاں پہاڑ ایک اونچی دیوار کی طرح دھان کے کھیتوں سے یکایک اوپر اُٹھتا تھا۔ میم صاحبہ نے دور کا راستہ پکڑ لیا اور اس ہموار زمین تک پہنچ گئی۔ اور کندھے پر سامان اٹھائے پسینہ پونچھتا ہوا مُلّا سبحان بھی یہاں پہنچ گیا۔

سورج غروب ہونے والا تھا لیکن گرمی کی شدّت میں ابھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ آسمان نے سفید دھند والی ململ کی چادر اپنے اوپر اوڑھ لی تھی۔ پہاڑ پر یہ ہموار زمین کافی کشادہ تھی۔ اس کے ایک طرف لمبا اور اونچا پہاڑ جسے ڈل جھیل سے آتی ہوئی ہواؤں سے اپنا جلتا ہوا پتھریلا سینہ ٹھنڈا کر رہا تھا اور دوسری طرف یہ کشادگی یکایک ختم ہو جاتی تھی۔ جس کے سرے پر جا کر اگر آدمی نیچے کی طرف دیکھے تو محسوس کرے کہ وہ ایک اونچی دیوار پر کھڑا ہے۔

مُلّا سبحان نے کندھوں سے بوجھ اُتار دیا اور سُستانے بیٹھ گیا۔ میم صاحبہ نے اپنا دایاں ہاتھ آنکھوں پر سایہ دینے کے لئے پیشانی کی سیدھ میں رکھا اور دور دور تک دیکھنے لگی۔ چند لمحے تک دیکھنے کے بعد اُس نے مُلّا سبحان سے اس انداز میں کہا جیسے وہ سوچ میں کھوئی ہوئی ہو۔ "ایزل کھڑا کر دو۔"

مُلّا سبحان نے ایزل کھڑا کر کے اس پر بورڈ لگا دیا۔ میم صاحبہ آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر ٹہل رہی تھی اور دانتوں سے نچلے ہونٹ دبائے ہوئے کسی گہری سوچ میں پڑ گئی تھی۔ اُس نے ایک بار پھر آنکھوں کے اوپر ہاتھ کا سایہ کر کے دُور دُور تک دیکھا۔ اس کے بعد ایک آہ بھری۔ مُلّا سبحان کا خیال تھا کہ اب میم صاحبہ اُس سے کچھ مشورہ لے گی مگر میم صاحبہ نے اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ وہ اُس کو بھلا کر ایک طرف چلدی اور وہیں بیٹھ گئی۔

کچھ دیر کے لئے میم صاحبہ خاموش بیٹھی رہی۔ لیکن اُس کی آنکھوں کی کیفیت سے یوں لگتا تھا جیسے اُس کی کوئی چیز کھو گئی ہو اور اب وہ یہی چیز دور کے پہاڑوں میں، ڈل جھیل کے پانیوں میں، آسمان میں اور نہ معلوم کہاں کہاں تلاش کر رہی ہو۔

میم صاحبہ کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے پریشانی اور بے چینی ظاہر ہو رہی تھی۔

میم صاحبہ نے جیب سے ایک چھوٹی سی کتاب نکالی، اس کے کچھ صفحے پلٹے اور پڑھنا شروع کیا۔ اُس کے چہرے پر تقدس کے ویسے ہی نقوش اُبھر آئے جیسے کسی عورت کے چہرے پر قرآن شریف پڑھتے وقت اُبھر آتے ہیں۔ لیکن میم صاحبہ اونچی اور سُریلی آواز میں گانے لگی۔ وہ آنکھیں بند کر کے جھوم جھوم کر گا رہی تھی جیسے چراگاہ میں کوئی چرواہن اپنے محبوب کو پُکار پُکار کر کہہ رہی ہو ——

بھوک لگے تو تمہیں پنیر کھلاؤں گی

پیاس لگے تو تمہیں تازہ دودھ پلاؤں گی

آ میرے محبوب میں تیرے انتظار میں ہوں!

مُلّا سبحان کو اس سُریلی آواز نے دوسری دنیا میں پہنچا دیا۔ وہ آنکھیں بند کئے اپنا جسم اس طرح ہلا رہا تھا جیسے وہ مسجد میں بیٹھا تسبیح پڑھ رہا ہو۔ اُس کو محسوس ہوا کہ اس آواز کے ساتھ اُس کا وہی رشتہ ہے جو بین کی آواز کے ساتھ سانپ کا۔ خون یا گوشت کا رشتہ نہیں مگر اس سے بھی زیادہ مضبوط رشتہ۔

سورج غروب ہونے جا رہا تھا۔ دُور پہاڑوں کی چوٹیوں کے پیچھے سے سنہری شعلوں کا جلوس جیسے اُس کے خیر مقدم کے لئے کھڑا تھا۔ آسمان کا رنگ بدل رہا تھا۔ پہاڑوں کے جسم کا اندرونی نور چمک اُٹھا۔ دُور کے پہاڑوں کی چوٹیاں برفیلی پوشاکیں پہنے، قطاروں میں کھڑی تھیں۔ ان چوٹیوں کے بہت اوپر مگر نیلے آسمان کے نیچے آکاش کی پریاں بادلوں کے جھولے پر خوشی سے جھول رہی تھیں۔

میم صاحبہ نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔ اس کی آنکھیں پچھم کی طرف اس خوبصورت منظر کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اس سے نظریں ہٹائے بغیر میم صاحبہ اُلٹے پاؤں بورڈ کے قریب پہنچی۔ برش اُٹھا کر اس نے بڑی احتیاط سے کینوس کی طرف بڑھایا۔ لیکن اس کا بڑھا ہوا ہاتھ یکایک رُک گیا۔ آسمان بہت اونچا اور کھلا ہوا تھا۔ پہاڑ دائیں بائیں، بہت دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ پہاڑوں کے قریب نچلی سطح پر مٹی کے ڈھیر اور ٹیلے تھے۔ ہر طرف درخت اور سبزہ تھا۔ ڈل جھیل اپنی چاندی جیسی سطح پھیلا کر اس پہاڑ کے دامن کے قریب پہنچ رہی تھی۔ وہ ہری پربت اور یہ کوہ سلیمان۔ ڈل جھیل کے ارد گرد

پارے کی طرح بنی ہوئی سڑک۔ سڑک کے اس طرف شالیمار پہاڑ کے دامن میں دھان کے لہلہاتے کھیت، پہاڑ پر یہ ہموار زمین۔ اس کے پیچھے شالیمار پہاڑ اور پہاڑ کے اوپر نیلا آسمان ــــ میم صاحبہ کا بڑھا ہوا ہاتھ یکایک رُک گیا۔ یہ سب کچھ لامحدود تھا۔ سچ مچ بہت ہی لامحدود۔ کیا میم صاحبہ یہ سارا حسن رنگوں میں سمو سکتی ہے؟ نہیں۔۔ نہیں۔۔۔۔ ہرگز نہیں

میم صاحبہ کے ہاتھوں سے برش چھوٹ گیا۔ مصوّر اپنے فن سے حسن میں اضافہ کرتا ہے، وہ نامکمل کو مکمل کر دیتا ہے۔ لیکن اتنا پھیلاؤ۔۔۔ اتنا حُسن۔۔۔ اتنا خوب صورت فن۔۔۔۔!

کیا میم صاحبہ اس میں کوئی اضافہ کر سکتی ہے۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔؟ یہ حُسن رنگوں میں نہیں سما سکتا۔ اس لامحدود حُسن کی بے حرمتی نہیں کی جا سکتی۔ میم صاحبہ پریشان سی ہو گئی

مُلّا سبحان کے دل میں خوف سا پیدا ہوا۔ اس نے سُنا تھا کہ شالیمار پہاڑ وں پر پریوں کا مسکن ہے۔ وہ کبھی کبھی کسی کو سزا دیتی ہیں۔ جب اس نے دیکھا کہ میم صاحبہ ایک مورتی کی طرح کھڑی ہے، نہ ہلتی ہے اور نہ حرکت کرتی ہے تو اس کے دل میں خوف سا پیدا ہوا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ میم صاحبہ کس سوچ میں پڑی ہوئی ہے۔

میم صاحبہ واقعی ہلنے یا حرکت کرنے سے ڈر رہی تھی۔ اُس کو محسوس ہو رہا تھا۔ کہ اس دور تک پھیلے ہوئے دلکش نظارے کے لئے فطرت نے اس کے لئے یہی جگہ تجویز کی ہے اور اگر وہ اس جگہ سے ہل گئی تو فطرت کا سارا نظام درہم برہم ہو جائیگا۔ اور قیامت آ جائے گی۔ وہ ایک جگہ مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔

"میم صاحبہ!" مُلّا سبحان نے پکارا اور میم صاحبہ جیسے چونک اُٹھیں۔ آواز سُن کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور جیسے اپنے آپ سے کہا۔ "افسوس کہ اس جگہ میرا کوئی راہبر نہیں ہے۔ یہاں تو ورڈس ورتھ بھی نہیں پہنچ سکا۔ یہاں وانگ گاف بھی مجھے راستہ نہیں دکھا سکتا۔"

میم صاحبہ کمر کے پیچھے دونوں ہاتھ رکھ کر کبھی ٹہل رہی تھیں اور کبھی پریشانی کی سی حالت میں دائیں بائیں آنکھیں اُٹھاتی دیکھ رہی تھی۔ مُلّا سبحان کو رمضان یاد آیا۔

مُلّا سبحان کو میم صاحبہ کی جگہ رمضان کی صورت دکھائی دے رہی تھی۔

میم صاحبہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ "راستے صرف دو ہیں۔ یا تو اس دل کشی کو اپنی روح کے اندر جذب کر لو یا روح کو آزاد کر کے اسے اس بے پناہ حسن میں غرق کر دو۔"

میم صاحبہ بالکل اس طرح کی باتیں کر رہی تھی جس طرح رمضان کرنا چاہتا تھا لیکن نہ کر سکتا تھا۔ مُلّا سبحان کو محسوس ہو رہا تھا کہ رمضان کو یہی کچھ کہنا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے رمضان آج خود پہاڑ کی اس کشادہ زمین پر یہ باتیں کہنے کے لئے آیا ہے۔

ٹہلتے ٹہلتے میم صاحبہ رُک گئیں۔ دور برفیلی چوٹیوں کے اوپر مگر نیلے آسمان کے نیچے بادلوں کے جہاز کی طرف اُنگلی اُٹھا کر اس نے مُلّا سبحان سے کہا۔ "کیا اس جگہ کسی کی روح پہنچ گئی ہو گی؟"

اس کے بعد اس نے خود ہی کہا "اس جگہ آدمی جسم سمیت نہیں پہنچ سکتا۔ مگر وہاں پہنچ کر روح کو مکمل سکون ملتا ہو گا۔ کیا وہاں کسی کی روح پہنچی ہو گی؟"

مُلّا سبحان نے فوراً جواب دیا۔ "وہاں نہیں مگر اس دوسرے پہاڑ پر جس کو ہم کوہ سلیمان کہتے ہیں ایک روح پہنچ گئی ہے۔ وہاں میرا بیٹا رمضان ..."

میم صاحبہ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی اس کی بات کا جواب دے رہا ہے مگر جواب مُلّا سبحان دے رہا تھا۔ وہ حیرت سے دوڑتی ہوئی اس کے قریب آئی اور آنکھوں میں کہا۔ "بولو کون رمضان؟ کہاں کا رمضان؟" میم صاحبہ بہت بےچین ہو گئی۔

مُلّا سبحان نے اپنے بیٹے رمضان کی کہانی شروع کی۔ "رمضان میرا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ سپاہی تھا۔ وہ دوسری جنگ عظیم میں ساری دنیا گھوم آیا تھا۔ وہ جنگ میں نہیں مرا تھا۔ جنگ سے لوٹ کر وہ کنول کے پتوں پر پھیلی ہوئی بوند کی موتیوں پر عاشق ہو گیا تھا۔ وہ بادل کے ٹکڑے دیکھ دیکھ کر پاگل ہو جاتا تھا۔ وہ شام کے سائے اور صبح کی لالی پر مرمٹا تھا۔ وہ بہتے پانی کو سینے سے لگاتا تھا۔ وہ ٹھنڈی ہوا سے بغل گیر ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ بید کے پیڑوں کے جھنڈ میں معشوق کی زلفیں تلاش کرتا تھا۔ لوگوں نے کہا کہ اُس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں نے بھی کہا کہ وہ

وہ دماغ کھو چکا ہے۔"

"اور پھر اُس کا کیا ہوا؟ کہاں ہے وہ؟" میم صاحبہ تیز تیز باتیں کر رہی تھی۔ اُس کی سانس پھول رہی تھی۔ آنکھوں میں وحشت تھی۔ مُلّا سبحان تاڑ گیا کہ وہ بخار سے جل رہی ہے۔ مگر مُلّا سبحان نے اس کے بخار کی طرف دھیان نہیں دیا۔ وہ آج رمضان کی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ رمضان کی باتیں کر رہا تھا۔ آج اُس کے ذہن کے کواڑ یکایک کُھل رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا: "ایک دن رمضان نے مجھے بُلایا۔ پت جھڑ بیت چکا تھا اور جاڑا آ چکا تھا۔ رمضان بیمار ہو گیا تھا۔ رمضان نے ایک دن مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا۔ "بابا کیا ہوا وہ پانی... وہ سبزہ....؟" میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ میں نے سوچا کہ بچہ بیمار ہے لیکن اس کا دل رکھنے کی خاطر میں نے پھر بھی کہا تھا۔ "جاڑا ختم ہو جائے میرے بیٹے تو بہار میں یہ سب چیزیں پھر دیکھنے میں آئیں گی۔" رمضان نے کہا تھا۔ "بابا! جاڑا بہت بے رحم ہے، بہار کب آئے گی؟"

میم صاحبہ چلا کر بولی — "بہار حُسن اور روح کے بلاپ کو کہتے ہیں مُلّا سبحان"۔

مُلّا سبحان نے اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ رمضان کی پوری کہانی مکمل کرنا چاہتا تھا اور اس لئے کہہ رہا تھا: "آخر میں رمضان نے مجھ سے کہا۔ بابا میں یہ ویرانی برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر میں مر گیا بابا تو مجھے کوہ سلیمان پر دفن کرنا اور قبر میں میری آنکھیں ڈل جھیل کی طرف رکھنا۔ میں وہیں بہار کا انتظار کروں گا۔"

میم صاحبہ کے سینے کے پنجڑے میں جیسے اس کی روح پنکھ پھڑپھڑا رہی تھی۔ اُس کے دل پر جیسے کوئی وزنی چیز دباؤ ڈال رہی تھی۔

مُلّا سبحان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ کہہ رہا تھا۔ "اسی رات کو رمضان ڈل جھیل میں کود اتھا اور صبح میں نے دیکھا کہ وہ مر چکا تھا۔"

یہ سنتے ہی میم صاحبہ کھڑی ہو گئی۔ اُس نے آنکھیں جھکا کر اپنے پاؤں کی اُنگلیوں پر نظریں جمائیں اور کہا۔ "اس پنجڑے سے میں روح کو آزاد کر کے لامتناہی حُسن میں ڈوب جانا ہی حیاتِ جاوداں ہے۔ رمضان نے مجھ سے اس معاملے میں پیش قدمی کر کے راستہ دکھا دیا ہے۔"

مُلّا سبحان کی آنکھوں میں بجلی سی کوند گئی۔ میم صاحبہ پہاڑ کی اسی کُھلی جگہ سے

یکایک غائب ہو گئی تھی اور اس نے خلاء میں چھلانگ لگا دی تھی۔

مُلاّ سبحان چند سیکنڈ کے لئے دم سادھ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور منٹ کے بعد آنکھیں کھول دیں اور سر کو اس طرح ہلایا جیسے کسی بات کا اقرار کر رہا ہو۔ اور کہا۔

"آج میں بات کی اصلیت تک پہنچ گیا ہوں۔"

وہ بالکل خاموش تھا۔ بغیر کسی خوف یا ڈر کے وہ اُٹھا اور پہاڑ کی اس کشادہ جگہ کے اس سرے سے نیچے دیکھا۔ میم صاحبہ باہیں کھولے دامن کی چٹانوں کے بیچ جیسے ایک چٹان سے بغل گیر ہو رہی تھیں۔

مُلاّ سبحان نے سب چیزیں اکٹھا کر کے کندھے پر اُٹھائیں۔ پہاڑ کے دامن سے میم صاحبہ کی لاش بازوؤں میں اُٹھالی اور شالیمار کی طرف چل دیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

عیدی

واجدہ تبسم

میرے گلے میں ایک بے حد خوب صورت لاکٹ جھولتا رہتا تھا۔ دل کی وضع کا سونے کا یہ لاکٹ کتنوں ہی کی توجہ اپنی طرف کھینچ چکا ہے ــــ سکھی سہیلیاں مجھ سے چھیڑ سے پوچھتی ہیں ــــ "یہ کیا اپنے پریتم کی تصویر اس میں چھپا رکھی ہے جو کبھی گلے سے الگ ہی نہیں کرتی ــــ"

میں مسکرا کر رہ جاتی ہوں ــــ ایک غم ناک سی مسکراہٹ۔ کیا لاکٹوں میں صرف پریتم کی تصویریں چھپائی جاتی ہیں؟ یہ کوئی ایسا راز تو نہیں جسے میں زمانے بھر کی نگاہ سے چھپاتی پھروں ــــ لیکن میں اکثر یہ سوچ کر رہ گئی ہوں کہ اگر میں نے یہ بتا دیا کہ اس لاکٹ میں میں نے کیا سجا رکھا ہے تو کیا سننے والے واقعی یقین کر لیں گے؟

آج عید کا دن ہے ــــ پتہ نہیں اس دن میں کیا خاص بات ہوتی ہے کہ بھولے بسرے پرانے چہرے بھی یوں رہ رہ کر یاد آتے ہیں کہ دل کلپ کلپ جاتا ہے۔ میری یادوں کے اُفق پر ایک چہرہ عید کے دن خاص طور سے جگمگاتا ہے ــــ یوں جیسے وہ چہرہ نہ ہو، چاند ہو جس کی جگمگاہٹ سے دل کا کونا کونا روشن ہو جاتا ہے۔ یہ میری دادی بی کا چہرہ ہے ــــ محبت کی شعاعوں سے دمکتا ہوا۔ پیار میں ڈوبا ہوا ــــ

برسوں پہلے کی بات ہے، ان دنوں جب شاید میں چھ سات برس کی ننھی سی معصوم اور نادان بچّی تھی، اس سال عید ہمارے لئے محرم بن کر آئی تھی۔ اس لئے کہ عید سے چند روز پہلے ہماری امّی چل بسی تھیں۔ عید کے دن جو چہل پہل اور خوشی ہوتی ہے اس کا دُور دُور پتہ نہ تھا۔ بس ایسا لگتا ہے ابھی ابھی کوئی میّت اُٹھائی گئی ہے۔ نانی اماں کا اس دن روتے روتے بُرا حال تھا۔ ہمیں نہ عید کے اہتمام میں نئے کپڑے پہنائے گئے، نہ گھر میں اچھے پکوان پکے، جب محلے ٹولے کے سارے بچّے رنگ برنگ کے کپڑے پہن کر اِدھر اُدھر اُچھل پھاند مچانے لگے۔ اس وقت اچانک اس جان لیوا حقیقت کا انکشاف ہوا کہ آج ہمارے گھر عید نہیں آئی ہے — جب ہم نے ناسمجھی سے ضد کرنی شروع کی کہ ہم بھی نئے کپڑے پہنیں گے۔ ہم بھی میٹھا کھائیں گے تو نانی اماں نے نوکر کو بُلا کر ہدایت کی کہ ان بچوں کو راحت بوا کے ہاں چھوڑ آ۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

نوکر نے ہماری انگلیاں پکڑیں، اور ہمیں ایک صاف ستھرے لِپے پُتے چھوٹے سے گھر میں چھوڑ آیا۔ وہیں میں نے پہلی بار محبت سے بھرپور ایک چہرہ دیکھا۔ وہ نانی اماں کی سہیلی راحت بوا تھیں اور ہماری دادی بی اُنھوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور گلے سے لگاتے ہی اُن کے مُنہ سے گھُٹی گھُٹی چیخیں نکل گئیں — "آج اگر تمہاری ماں زندہ ہوتی۔" آنسوؤں نے اس کا گلا دبوچ لیا اور وہ پھپک پھپک کر رونے لگیں — ہم حیرت سے اِنھیں دیکھ رہے تھے۔ ہماری امّی کے لئے یوں دھاروں دھار رونے والی یہ مہربان ہستی کون ہے ؟۔ پھر اُنھوں نے سنبھل کر ہماری سہمی ہوئی صورتوں کو دیکھا اور بڑے پیار سے غسل خانے میں لے گئیں۔ مُنہ ہاتھ دھلوا کر اُنھوں نے بے حد پیار سے میرے سر میں تیل ڈالا اور چوٹیاں گوندھنے بیٹھ گئیں — جب بھیا کی اور میری روتی صورتیں سج سنور گئیں تو اُنھوں نے بے حد پیار سے دسترخوان بچھایا اور کئی طرح کے کھانے لا کر چُن دیئے۔ وہ مُنہ میں نوالے دے دے کر سر پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر ہمیں کھانا کھلاتی رہیں اور جب نیند سے ہماری آنکھیں مُندنے لگیں تو اُنھوں نے کھلے برآمدے میں ہوا کے رُخ پر ایک صاف ستھرا بستر بچھایا اور ہم دونوں بہن بھائیوں کو تھپک تھپک کر سلا دیا۔

کوئی تین چار بجے کے قریب ہم اُٹھے۔ اُنھوں نے پھر سے مُنہ ہاتھ دُھلوا کر

ہمیں محبت سے سنوارا اور دھوپ ڈھلے جب ہم گھر چلنے کو ہوئے تو انھوں نے دروازے تک ہمیں لاکر چھوڑا ___ اور جانے سے پہلے پہلے اپنی کمر میں اڑسی ہوئی ایک بوسیدہ سی تھیلی نکالی اور بے حد پیار سے ہماری مٹھیاں کھلوا کر اس میں ایک ایک چونّی رکھی اور بولیں۔ "یہ تمہاری عیدی ہے بچو۔"

میں نے بے حد غیر یقینی انداز سے پہلے اپنی مٹھی میں رکھی ہوئی چونی کی طرف دیکھا اور پھر دادی بی کی طرف پہلی بار شاید میرے ہونٹ کھلے۔ "یہ ___ یہ، یہ میری ہے ___؟"

"ہاں بیٹی بالکل تیری ہے۔" پھر وہ بے حد پیار سے میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر بولیں:-

"اچھا یہ بتا تو اپنی نانی اماں سے تو نہیں کہہ دے گی کہ میں نے تجھے چونی دی ہے۔"

"بالکل نہیں ___" میں نے مٹھی کو مضبوطی سے بند کرتے ہوئے کہا۔ دادی بی جانتی تھیں کہ نانی اماں ان معاملوں میں حد درجہ سخت واقع ہوئی ہیں وہ اس بات کی مطلق روادار نہ تھیں کہ ہم کسی سے ایک پائی بھی لیں۔ بھلے سے وہ عیدی کے ناطے ہی کیوں نہ ہو۔ جب دادی بی مطمئن ہو گئیں تو انھوں نے بڑے رازدارانہ لہجے میں پوچھا ___ "اچھا بی بی یہ بتا تو ان چار آنوں میں کیا کیا خریدے گی۔"

یہ سوال مجھے گڑبڑا گیا ___ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ نانی اماں نوکر کے ہاتھ میں دو آنے دے کر ڈھیروں سودا لانے کو کہا کرتی تھیں اور وہ زمانہ اس قدر سستے کا زمانہ تھا کہ تھیلا بھر سودا لانے کے باوجود بھی نوکر دو تین پیسے نانی اماں کے ہاتھ میں واپس تھما دیا کرتا تھا ___ چار آنے میں تو ایک دنیا آ سکتی تھی۔ اگر گڑیا کا بیاہ ہی رچانے بیٹھ جاؤں تو ڈھیروں چاول شکر، گھی، میوے، پھر گوشت سبزیاں، کیا کیا نہ خرید سکوں گی۔ پوری بارات کھانا کھا کر اُٹھ جائے گی تب بھی چیزیں باقی بچ جائیں گی میری سمجھ میں قطعی نہیں آ رہا تھا کہ آخر میں اس خزانے کو کس طرح خرچ کر پاؤں گی۔ بس جی چاہ رہا تھا جلد سے جلد دادی بی کے چنگل سے نکل بھاگوں اور جس طرح بن پڑے اس دولت کو ٹھکانے لگا دوں ___ اس خیال کے آتے ہی پہلے تو میں نے کچھ شک و شبہ سے دادی بی کے چہرے کو دیکھا اور پھر تیزی سے مٹھی بند کر کے چوکھٹ سے اک دم باہر بھاگی ___ مجھے اپنے پیچھے دادی بی کی محبت اور ہنسی سے بھری ہوئی آواز سنائی دی، "ڈرتی ہے کہ کوئی اس کی رقم ہتھیا نہ لے ___"

اور یہ حقیقت بھی تھی۔

گھر آنے پر میں اور نئے نئے وسوسوں میں اُلجھ گئی۔ آخر میں کس طرح یہ رقم خرچ کرسکتی تھی؟ یوں نہیں ــــ میں نے سوچا گھر سے ملی ہوئی جو دُکان ہے وہیں چل کر سوچتے ہیں، اچھی اچھی چیزیں دیکھ کر خود ہی سوجھ جائے گا کہ کیا لیا جائے، کیا نہ لیا جائے۔

دوسرے دن جب نانی اماں اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔ میں آنکھ بچا کر گھر سے نکلی اور سیدھی کونے والی دُکان پر جا پہنچی ــــ ایک انگلی دانتوں تلے دبائے میں بڑی دیر تک محویت کے عالم میں دُکان کا جائزہ لیتی رہی ــــ کئی گاہکوں سے نمٹنے کے بعد آخر دُکان دار مجھ سے مخاطب ہوا، "تمہیں کیا چاہیئے بی بی ــــ؟"

میں ہڑبڑا سی گئی، وہ ــــ وہ کونے میں جو گڑیا ہے وہ چاہیئے"

دُکان دار نے گڑیا نکال کر سامنے رکھ دی اور پھر پوچھا" اور کیا چاہیئے ــــ؟"

"اور گڑیا کے گلے کے لئے مالا ــــ موتیوں والی ــــ"

"چلئے یہ قصہ بھی تمام ہوا" دُکان دار خوش دلی سے مسکرایا۔

"اب بتایئے"

"کاجو ــــ"

"اور ــــ؟"

"وہ کھٹی میٹھی گولیاں ــــ"

"اور ــــ؟"

میں نے جھجک کر کہا" رنگین پنسل ــــ"

"اور؟"

میں نے کچھ غیر یقینی نگاہوں سے سامان کے ڈھیر کو تاکا ــــ اتنا کچھ خرید لیا اور یہ دُکاندار ابھی تک اور ــــ اور کئے جا رہا ہے۔ میں نے مطمئن ہو کر کہہ دیا ــــ" اب بس ــــ"

دُوکاندار نے سامان کا بنڈل بنا کر میرے ہاتھوں میں تھمایا اور ساتھ ہی بچے ہوئے چھ پیسے بھی میرے ہاتھ میں رکھ دیئے۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ دادی بی کیوں پوچھ رہی تھیں کہ بتا بی بی تو ان چار آنوں میں

کیا کیا خریدے گی ؟ — تو کیا دادی بی نے واقعی اس قدر رقم حوالے کر دی تھی — ؟ ایک دم سے دادی بی مجھے "قصے" کہانیوں والی مہربان پری لگیں جو خوش ہو کر جو جی میں آتا بخش دیا کر

میں خوشی سے لدی پھندی گھر لوٹی — سامنے ہی نانی اماں کھڑی مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھیں ۔ میرے پاؤں ٹھٹک گئے — اب تو خوب پٹائی ہوگی ۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب سارا قصہ سننے کے بعد نانی اماں کی آنکھیں خود بھی آنسوؤں سے بھر گئیں اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں "بڑی نیک بخت بی بی ہے — خدا دونوں جہاں میں اس کی نیکیوں کا صلہ دے ۔ گوشت پوست سے نہیں محبت سے بنی ہوئی عورت ہے راحت لوا ۔"

نانی اماں کے ان الفاظ سے میرے دل میں دادی بی کی محبت اور قدر دوگنی چوگنی ہوگئی ۔

اگلی عید پر بھی ہم دادی بی سے ملنے گئے ۔ وہ اسی تپاک سے ملیں جیسے سال بھر ملتی رہتی تھیں ۔ اور اس عید پر بھی اُنھوں نے وداع کرتے ہوئے اپنی بوسیدہ سی تھیلی میں سے چوتی نکال کر دی اور اسی رازدارانہ لہجے میں پوچھا ۔

"بتا بی بی ان چار آنوں میں تو کیا کیا خریدے گی — ؟"

⁂ ⁂

کتنے سال ایک ایک کر کے یوں ہی گزر گئے ۔ زمانے کے انداز بدلتے رہے مہنگائی بڑھتی رہی — پھر جنگیں ہوئی ۔ دنیا کے نقشے بدلے — ہندوستان پاکستان آزاد ہوئے ۔ ایک نئی دنیا کی داغ بیل پڑی اور ہم بھی اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر پردیس میں آبسے ۔ اب تک زندگی میں کوئی لمحہ خوشی کا میسّر نہ آیا تھا ۔ وہی غربت ، وہی تنگی ۔ وہی حالات ، — سوچا تھا کہ نئی جگہ شاید نیا آب و دانہ بدلے گا ۔ لیکن قسمتیں بھی کبھی بدلا کرتی ہیں ؟ پردیس آکر مصیبتوں کی داستان اور بھی دردناک اور طویل ہوگئی ۔ عید آتی تو اور بھی یاد آتا کہ کس طرح دادی بی چار آنے دیا کرتی تھیں جو ایک مدّت کی خوشی کا سامان ہو جاتے تھے ۔ پردیس آکر اس دولت سے بھی محرومی ہوگئی ۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

پھر کچھ سال اور گزرے — اور زمانہ اس تیز رفتاری سے بدلا اور مہنگائی یوں

بڑھی کہ چار آنے تو کیا چار روپے بھی حقیر رقم معلوم ہونے لگی۔ بچپن میں سال بھر عید کا انتظار واقعی عید کی طرح رہتا تھا۔ اب عید آتی تو سادے دن کی طرح یوں ہی گزر جاتی۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ کسی بھی عید کو دادی بی کی یاد نے ساتھ نہ چھوڑا۔

وقت نے ایک اور بھرپور انگڑائی لی اور میری شادی ہو گئی۔ گویا زندگی بھر کی تمام کلفتوں مصیبتوں کا خاتمہ ہو گیا ــــ یہ یقین پختہ تر ہو گیا کہ خدا مصیبت کے بعد راحت اور خزاں کے بعد بہار ضرور دیتا ہے۔ میرے شوہر بڑے بزنس مین تھے۔ روپے پیسے کی کوئی قدر ہی نہ تھی۔ جنّت کا ہمارے ذہنوں میں یہی تصوّر ہے نا کہ جس چیز کی تمنّا کرو آموجود ہوتی ہے۔ تو مجھے جیتے جی گویا جنّت مل گئی تھی۔ پھر جب خدا نے اس چمن میں ایک نوشگفتہ کلی اور پھر ایک پھول بھی کھلا دیا تو زندگی سچ مچ ہی بہاروں اور جنت کا حقیقی روپ ہو گئی۔

دنیا وہی تھی ــــ یقیناً دنیا کی مشکلات بھی وہی ہوں گی، لیکن میرا یہ حال تھا کہ کبھی ایک گاڑی ایک سال استعمال کر لی اور اس سے جی بھر گیا تو یوں نئی خرید لی جیسے بیس ہزار کی نہ ہو بیس روپے کی بات ہو۔ شہر اور میدان میں رہتے رہتے جی اوب گیا تو پہاڑوں پر گرمیاں گزارنے چلی گئی۔ تقریباً ہر ہل اسٹیشن پر ذاتی گھر انھوں نے خرید رکھے تھے اور ویسے بھی رہنے کے لئے بمبئی جیسے شہر میں اتنی بڑی کوٹھی تھی کہ چلتے چلے جاؤ مگر کوٹھی ختم نہ ہو۔ اب عید آتی تو ان ہنگاموں کے ساتھ کی خریداری شروع ہوتی تو ختم ہوتے ہی میں نہ آتی اور گھر یوں بھر جاتا کہ لگتا کہ دکانیں کی دکانیں گھر میں لا ڈالی ہیں۔

اسی طرح چند سال اور گزرے اور پھر اچانک ایک موقع ایسا آیا کہ مجھے برسوں بعد وطن عزیز میں عید منانے کا موقع ملا ــــ جب ہم اپنے آبائی مکان میں اُترے تو ایسا لگتا تھا کہ یہ گھر نہیں روحوں کا ویران مسکن ہے۔ محلے ٹولے کے پرانے لوگ جانے کدھر جا بسے تھے۔ لے دے کر گھر میں ایک پرانے وقتوں کا بوڑھا مالی رہ گیا تھا جو سرِ شام ہی ننھا سا میلا دیا جلا کر راہ داری والے طاقچے میں رکھ دیتا ــــ پرانے دن پرانی باتیں گزری ہوئی گھڑیاں یاد آ آ کر دل کو جیسے مسوسنے لگیں۔ شہر ہوٹلوں اور بڑے بڑے ریستورانوں سے بھرا پڑا تھا ــــ یہ کیا ضرور تھا کہ ہم اُسی مزار جیسی ویران حویلی میں عید مناتے ــــ لیکن میں نے سوچا پرانی یادوں کو تازہ کر لینے میں کیا حرج ہے۔

جب وہ عید کی نماز پڑھ کر لوٹے تو میں سراپا بہار بنی کھڑی تھی۔

"اوہو — یہ ٹھاٹھ ہیں!" اُنھوں نے پیار سے چھیڑا۔ قیامت نظر آ رہی ہو — کہاں کی تیاری —؟"

میں نے ایک نظر اپنے آپ پر ڈالی — یہ ساڑھی گیارہ سو میں اُنھوں نے خاص طور سے مجھے عید پر پہننے کے لئے دلائی تھی — یوں چمکتی جگمگاتی مانو آگ لگی ہے۔ کانوں میں ہیروں کے دمکتے ہوئے لانبے لانبے جھمکے۔ ہاتھوں میں ساڑھی سے میل کھاتی ہوئی اصلی زمرّد کی چوڑیاں۔ گلے میں جڑاؤ ہار، ناک میں تارے کی طرح جگ مگ کرتی ننھّی سی لونگ — میں دُلہنوں کی طرح بھرپور انگشتریاں اور پیروں میں نازک نازک چپلیاں جو سونے کے تاروں کی بنی ہوئی تھیں۔

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور ہنس کر بولی "تیاری؟ ہاں تیاری ہے تو سہی اور ایک بہت اہم ہستی سے ملنے کی ہے۔"

"ذرا ہم بھی اس خوش نصیب کا نام سُنیں" وہ شرارت سے بولے۔

میں بچوں کی سی معصوم خوشی سے بولی۔ "آپ سن بھی لیں تو اُس کی اہمیت کو نہ سمجھ پائیں گے" پھر قدرے رُک کر بولی "وہ مری دادی بی ہیں"۔

"تمہاری دادی بی —؟" وہ حیرت سے بولے۔ مگر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تمہاری دادی بی کے انتقال کو تو ایک مدّت ہو چکی ہے"۔

"ہاں لیکن یہ دادی بی سدا میری رگِ جان سے بھی قریب رہی ہیں۔ آپ ملیں تو سہی پھر کہئے گا کہ ایسی محبت والی ہستیاں صرف کتابوں ملتی ہوں تو ہوں — اس دنیا میں تو مثال ناممکن ہے۔"

اُنھوں نے حیرت سے مجھے دیکھا اور بنا کچھ کہے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

ہماری لمبی کار رن کر کے ایک بوسیدہ سے مکان کے پاس سے گزری اور میں نے ذرا چلّا کر کہا "بس بس..... روک دیجئے..... یہی میری دادی بی کا گھر ہے" کار ایک نرم سے جھٹکے کے ساتھ رُکی اور کار کے رُکتے ہی بہت سارے بچّے بھی وہاں آ کر کھڑے ہو گئے اور حیرت سے گردنیں اونچی کر کے دیکھنے لگے۔

میں جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی ایسا لگا کہ کسی محل سے نکل کر ماچس کی ڈبیا میں بند ہو گئی ہوں۔ ایک پرانی سی بو نے میرا استقبال کیا اور ہلکے ہلکے اندھیرے سے جب میری آنکھیں مانوس ہو گئیں تو میں نے دیکھا کہ کونے میں ایک مڑی تڑی گٹھری سی پڑی ہے۔

"کون ہے ــــ ؟" پاؤں کی چاپ سن کر ایک کمزور سی آواز نے سر اٹھایا۔

"ارے یہ دادی بی ہیں" میں نے دکھے دل سے سوچا۔ بڑی ہمت جمع کر کے آواز نکالی "دادی بی میں ہوں ــــ آپ کی بی بی"

یوں جیسے ذہن پر زور ڈال کر انھوں نے سوچنا شروع کیا ہو ــــ پھر خوشی سے لرزتی آواز میں انھوں نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے ــــ "اری بی بی تو ــــ ؟ آمنہ بوا کی نواسی ہے نا تو ــــ ؟" گویا انھوں نے یقین کر لینا چاہا ہو۔

"ہاں دادی بی میں ہوں نا ــــ آپ مجھے بھول گئیں"

شرمندگی کے ہلکے سے غبار میں لپٹی اور دکھ میں ڈوبی آواز میں وہ بولیں۔

"نہیں بی بی تو کوئی بھولنے جیسی چیز ہے۔ مگر برس بھی کتنے گزر گئے۔ کم بخت آنکھیں بھی تو جاتی رہیں"

میرے دل پر ایک گھونسہ سا پڑا ــــ میں سہم کر بولی۔ "دادی بی آپ کو نظر نہیں آتا ــــ ؟"

"نہیں بی بی ــــ بس اب تو آنکھوں آگے آگے مستقل رات کا سا منظر ہے۔ اندھیرا ہی اندھیرا ہے ــــ وہ ذرا ہنس کر بولیں" اور بی بی اب دنیا میں دیکھنے کے لئے رہ بھی کیا گیا ہے۔ اپنے بیگانے ایک ایک کر کے سارے مر کھپ گئے یا پاکستان چلے گئے مگر اتنے دنوں میں آج دل چاہ رہا ہے کہ آنکھیں ہوتیں تو اپنی بی بی کو ایک نظر دیکھ تو لیتی۔

تیری شادی وادی ہو گئی یا نہیں بی بی ــــ ؟ وہ محبت سے پوچھ رہی تھیں

دکھ اور شرم سے بوجھل آواز سے میں بولی۔ "جی ہاں دادی بی ــــ ہو گئی ہے"۔

"بچے وچے ہیں ــــ ؟"

"ایک لڑکا ایک لڑکی ہے۔"

"ساتھ نہیں لائی"

نہیں بی — بمبئی میں گھر پر ہی ہیں۔"

"چلو اچھا ہوا۔" وہ سکھ کی سانس لے کر بولیں۔ "بن ماں کی بچّی تھی ٹھکانے سے بیٹھ گئی۔" ایک دم جیسے انھیں کچھ یاد آیا — وہ مجھے ہاتھوں سے ڈھونڈتی ہوئی بولیں — "پر میرے لئے تو تو ابھی بھی بچہ ہی ہے۔ اب تو کچھ سوجھتا بھی نہیں ورنہ تیری کنگھی تو بھی کر دیتی — آج عید کا دن ہے نا — ہر عید کو میں تیرے بال سنوارا کرتی تھی۔ یاد ہے نا —"

میں نے گردن سے اونچائی پر بندھے اپنے بڑے سے جوڑے کو محسوس کیا جس میں چمپا کرن کا سونے اور موتیوں کا کلس جگ مگ کر رہا تھا اور سہم کر بولی۔ "دادی بی اب تو میں بہت بڑی ہو چکی ہوں۔"

"ہاں بی بی پر میرے لئے تو تو آج بھی وہی ننھی سی بچّی ہے جو میرے ہاتھوں کے بنے نوالے اکھا کر میرے بستر میں ہی سو جایا کرتی تھی۔" ایک دم اُنھوں نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھ کر کسی کو پکارنا شروع کیا۔ "اری زینو، او زینو — کچھ سویاں میٹھا ہو تو یہاں دے جا — میری بی بی آئی ہے۔" شاید وہ اپنی پڑوسن کو آواز دے رہی تھیں۔

ہائے یہ مجبور بڑھاپا — اور یہ محبت! میرا دل اندر سے رو اُٹھا، میں خود کو سنبھال کر بولی — "آپ تکلیف نہ کیجئے دادی بی — مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔ بس آپ بیٹھی باتیں کیجئے آپ سے ملے اتنے دن ہو گئے کہ جی چاہتا ہے بس آپ سے باتیں کئے جاؤں۔"

"ہاں بی بی — وہ دکھ سے بولیں "اب تو بڑی ہو گئی۔ تو عقل مند بھی ہو گئی۔ کوئی میرے پکارنے پر پلٹا نہیں تو تو نے کہہ دیا کہ مجھے بھوک نہیں — میں کیسے مان لوں کہ تجھے بھوک نہیں ہے —"

ماحول اس درجہ دردناک ہو گیا تھا کہ مجھے اپنے آنسو روکنا دوبھر ہو گیا — کتنی ہی خاموشی چھائی رہی مانو جگ بیت گئے ہوں۔ پھر میں خود کو سنبھال کر بولی، "دادی بی یہاں تو آپ کی دیکھ ریکھ کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ آپ میرے ساتھ میرے گھر بمبئی چلئے نا —"

وہ کرب ناک انداز سے مسکرائیں۔ "بی بی جانے والی ہوتی تو پاکستان نہ چلی گئی

ہوتی۔ ایک ایک نے خوشامد کی مگر مجھے میری مٹی عزیز ہے۔ اب تھوڑے دن رہ گئے۔ کہاں جاتی پھروں گی ــــ بس خدا عزت سے اُٹھالے، یہی دعا ہے۔" پھر وہ کچھ یاد کر کے بولیں ــ "تیری نانی تو ابھی ہیں بی بی۔"

"ہاں دادی بی ــــ وہ بھیا کے پاس رہتی ہیں۔"

جس در و دیوار کے سائے تلے اور جس محبت بھری آغوش میں ہمیشہ میں ایک سکون پایا کرتی تھی آج وہیں مجھے کانٹوں کی سی چبھن محسوس ہو رہی تھی۔ اک درد سا دل میں اُٹھ رہا تھا ــ جی چاہ رہا تھا چیخ چیخ کر روؤں مگر آنسو بھی جیسے مونہہ چھپا کر کہیں بیٹھ گئے تھے۔

"اچھا دادی بی اب میں چلوں ــــ" بڑی دیر بعد بڑی ہمت باندھ کر میں اتنا جملہ کہہ سکی ــــ

اچھا خدا تیرا نگہبان ہو بی بی ــــ وہ ٹوٹی آواز سے بولیں ــــ ایک دم اُنھوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

"مگر ذرا ٹھہرو ــــ اپنی عیدی تو لیتی جا ــ" اتنا کہہ کر انھوں نے ٹٹول ٹٹول کر اپنی بوسیدہ سی تھیلی کمر سے نکالی اور اس کے اندر بہت دیر تک انگلیاں گھنگھولنے کے بعد ایک سکّہ نکال کر مجھ سے تصدیق چاہی۔

"دیکھ تو ذرا یہ چونی ہی ہے نا ــــ؟"

میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی ــــ پھر اُنھوں نے ٹٹول سے میرا ہاتھ تھاما اور میری بند ہتھیلی کھول کر چونی اس میں رکھ کر پھر سے مٹھی بند کر دی اور بڑے ہی رازدارانہ لہجے میں پوچھنے لگیں ــ "اچھا بی بی ان چار آنوں میں کیا کیا خریدے گی ــــ؟"

پہلی بار میں خدا کا شکر ادا کیا کہ دادی بی کی آنکھیں چلی گئی ہیں، ورنہ اگر دادی بی یہ دیکھ لیتیں کہ میرے جسم پر ہزار بارہ سو کی ساڑی ہے۔ بدن زیورات سے بوجھل ہے۔ سر پر سونے کا کلس جگ مگ کر رہا ہے اور میں بڑی سی کوٹھی سے اُٹھ کر اتنی لمبی چوڑی کار میں بیٹھ کر ان سے ملنے آئی ہوں کہ ٹرک کار سے یہاں سے وہاں تک لبالب بھر گئی ہے تو ــــ تو ــــ تو ــ!

اب ضبط کی ہر حد ختم ہو چکی تھی۔ میں ننھے بچوں کی طرح کھلے دل سے چیخ چیخ کر رونے

محبت کا وہ عظیم عطیہ وہ چونی جو لاکھ خزانوں پر بھاری تھی۔ میری ہتھیلی پر لرز رہی ــــ میں

ان چار آنوں سے کچھ بھی نہیں خریدوں گی ـــــ میں ان چار آنوں کو کبھی خرچ نہیں کروں گی۔ کیوں کہ یہ تو وہ عظیم رقم ہے کہ چاہوں تو اس سے ساری دنیا خرید لوں، لیکن میں یہ کیسے گوارہ کر پاؤں گی کہ اس دولت کو خود اپنے ہاتھوں سے کسی اور کو دے دوں ـــــ یہ چونّی کسی دوکان دار کے ہاتھ میں نہیں جائے گی دادی بی ـــــ یہ سدا میرے دل میں تعویذ بن کر رہے گی۔

میں نے یہ سب کہنا چاہا لیکن آنسوؤں کی تیز بوچھار میں الفاظ ساتھ نہ دے سکے۔

٭ ٭ ٭

سکھی سہیلیاں مجھ سے چھیڑ سے پوچھتی ہیں۔ یہ کیا اپنے پریتم کی تصویر اس میں سجا رکھی ہے جو کبھی اس لاکٹ کو گلے سے الگ ہی نہیں کرتی ـــــ؟

لیکن میں یہ سوچ کر جواب دیتے دیتے رہ جاتی ہوں کہ اگر میں نے بتا بھی دیا کہ اس لاکٹ میں مَیں نے یہ کیا سجا رکھا ہے تو سُننے والے کیا واقعی یقین کر لیں گے ـــــ؟

●●

اسٹیفن زوئیگ

چاندنی گلیوں میں

ترجمہ یعقوب فاروقی

طوفانی ہواؤں کی وجہ سے جہاز کی روانگی میں کچھ دیر تھی اور ابھی شام بھی نہیں ہوئی تھی۔ جس گاڑی سے مجھے سفر کرنا تھا وہ بھی چھوٹ چکی تھی اس لئے میرے پاس پورا ایک دن تفریح کے لئے باقی تھا۔ اب میں اتنا طویل وقفہ کس طرح گزاروں یہ میرے لئے ایک مسئلہ بن گیا۔ سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ میں اس ویران ساحل پہ اجنبی تھا۔ میرے پاس کوئی خاص کام بھی نہ تھا کہ میں خود کو مشغول رکھ سکوں۔ قریب بجتی ہوئی موسیقی کی لہریں بھی بالکل بے جان محسوس ہو رہی تھیں۔ اب صرف ایک صورت یہ باقی رہ گئی تھی کہ میں اپنے جہاز کے دوسرے مسافروں سے وقت گزاری کے لئے باتیں کروں۔

ہوٹل کے جس کمرے میں ہم لوگوں کا قیام تھا وہاں جلے ہوئے کوئلے اور سگریٹ کے دھوئیں کی ناخوش گوار بو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس لئے اس میں ٹھہرنا بھی دشوار تھا۔ ہوٹل کے چاروں طرف طرح طرح کی گندگی پھیلی ہوئی تھی اور میری ناک میں ابھی تک ساحل پر پھیلے ہوئے جھاگ کی مہک سمائی ہوئی تھی۔ مجبوراً میں نے یہ طے کیا کہ ساحل سے دور اس بستی کی سیر کی جائے جہاں سے موسیقی کی دھیمی دھیمی آواز میرے کانوں میں آرہی تھی۔ یہ بات مجھے بہت اچھی لگتی ہے کہ دن کے کام سے فراغت کے بعد کہیں دور گھومنے چلا جایا جائے اور وہاں الاؤ کے کنارے بیٹھ کر رات کا کھانا کھایا جائے مگر وہاں پہنچ کر تھوڑی ہی دیر بعد اجنبی لوگوں کی کھوکھلی ہنسی

اور شور وغل کی وجہ سے میری طبیعت اُکتا گئی۔

جہاز کا اب تک کا سفر سکون سے کوسوں دور تھا۔ جہاز کی آواز اور سمندر کی لہروں کے ہچکولوں سے میری رگ رگ میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پیروں کی زمین کھسکتی جا رہی ہے اور گلیاں اور آسمان کسی بدمست شرابی کی طرح لڑکھڑا رہے ہیں۔ میرا سر بُری طرح چکرا رہا تھا اور شور وغل سے بچنے کے لئے میں ایک تنگ گلی میں گھس گیا جس کا نام تک مجھے نہیں معلوم تھا۔ کچھ دور چل کر ایک اور تنگ گلی سے گزرنا پڑا جہاں موسیقی کی آواز تقریباً بالکل ڈوب گئی تھی۔ اسی طرح ایک گلی کے ختم ہونے پر دوسری گلی کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ یہاں روشنی بھی بہت کم تھی۔ آسمان پر کچھ ستارے جھلملا رہے تھے۔ میں نے اوپر نگاہ اُٹھائی۔ چاروں طرف گہری تاریکی تھی۔

شاید یہ مچھیروں کی بستی تھی، اس لئے کہ میری ناک میں بھُنی ہوئی مچھلی کی مہک اور جھینگوں کی بدبو آ رہی تھی۔ اس کے علاوہ گندے اور تاریک مکانوں کے گرد مچھلی پکڑنے کے جال بھی پھیلے ہوئے تھے۔ اچانک میں ایک کنارے کی طرف نکل آیا۔ ہوا کا ایک خوش گوار جھونکا محسوس ہوا۔ اب تنہائی بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے اپنی چال دھیمی کر دی اور ان تاریک گلیوں پر غور کرنے لگا کیونکہ یہ گلیاں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں۔ مگر ایک بات جو ان سب میں مشترک تھی وہ تھی ان کی خاموشی اور پُرسکون فضا۔ حالانکہ ان میں سے اکثر و بیشتر گلیاں تاریک تھیں اور تقریباً ہر مکان سے ہلکی ہلکی موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔ مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں بالکل بند تھیں۔ صرف کہیں کہیں لال یا پیلی روشنی کی لالٹین نظر آ جاتی۔

مجھے ان مکانوں کے بارے میں کچھ جاننے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ یہ جگہیں واقعی عجیب و غریب تھیں جو اکثر و بیشتر جنسی خواہشات پورا کرنے کا بازار معلوم ہوتی تھیں جہاں بازاری مختلف جہازوں سے آئے ہوئے لوگ شب گزاری کی خاطر نکل پڑتے تاکہ اپنی خواہشات کی تکمیل چند گھنٹوں میں کر سکیں۔ یہ جگہیں اتنی بازاری تھیں کہ یہاں عزت والوں کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ چھوٹے چھوٹے کمروں میں رقص کرنے والے جوڑے رقص میں محو تھے۔ تاش کھیلنے والے دوسری طرف مشغول تھے اور دروازے پر ٹنگی ہوئی مدھم روشنی والی لالٹین

ہر راہی کو اندر آنے کی دعوت دے رہی تھی۔ شراب کے کاؤنٹر کے قریب نشے میں مدہوش لوگوں کی آوازیں بھی صاف سنائی پڑ رہی تھیں۔ یہاں پر جب کسی مچھیرے کی نگاہ دوسرے سے ملتی تو وہ پُر امید نظروں سے چاروں طرف دیکھتا اور اس کی آنکھیں چمک اُٹھتیں اور اُنھیں یقین ہو جاتا کہ اب ان کی حرص کی تکمیل کا سامان جلد ہی بغیر کسی خطرے کے ہو جائیگا۔ مگر یہ ساری باتیں باہر سے بالکل معلوم نہیں پڑتیں۔ اس کے لئے آپ کو اندر جانا پڑے گا اور تب ہی آپ کو سارے راز کھلتے نظر آئیں گے۔ بالکل اسی طرح کی سڑکیں اور گلیاں آپ کو ہمبرگ، کولمبو اور ہوانا میں بھی نظر آئیں گی جہاں دولت مند لوگ چکر لگاتے نظر آئیں گے۔ اس معاملے میں اونچے اور نچلے طبقے میں کافی یگانگت پائی جاتی ہے۔ اس لئے کہ بھوک تو ہر انسان میں ایک سی ہوتی ہے۔ یہ بے ہنگم گلیاں، بے راہ روی کے طور طریقے کو جنم دیتی ہیں۔ یہاں انسان بغیر کسی جھجک کے اپنی حیوانی خواہشات کو ہوا دے کر اس کی تکمیل بھی کر سکتا ہے۔ یہاں کسی قسم کے الزام کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس طرح یہاں ایسی بہت سی باتیں پوری ہو سکتی تھیں جن کا تصور عام طور پر خواب میں ہوتا ہے۔

مجھے بھی اس خوب صورت ماحول میں جانے کا شوق پیدا ہوا۔ قریب ہی چند عورتیں بار کے قریب بیٹھ کر فحش مذاق کر رہی تھیں اور ہر راہ گیر پر جملے کس کر خوش ہو رہی تھیں۔ چاروں طرف قہقہے کا شور تھا۔ کھڑکیوں پر لوگوں کے ہاتھ کی چھاپ تھی اور اسی طرح کی آوازیں ہر طرف گونج رہی تھیں۔ چاند ایک طرف خاموشی سے چمک رہا تھا ہر طرف خوشیوں کی آواز میں کسی بات کو صاف طور پر سُننا مشکل تھا۔ گلیوں اور سڑکوں کے اس ویران سلسلے میں میرا اپنا کوئی وجود نہیں رہ گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میرے جسم پر انجانے طور پر کسی اور کا قبضہ ہو گیا ہو۔ ارد گرد کے ماحول سے میرا کوئی رشتہ نہ تھا مگر پھر بھی ایسا لگتا تھا جیسے یہ سارا ماحول صرف میرے لئے ہو۔

میں خاموشی سے اس ماحول کا جائزہ لے رہا تھا کہ دور سے مجھے کسی گیت کی ہلکی ہلکی آواز سُنائی دی۔ یہ آواز بلاشبہ جرمن زبان میں تھی اور کسی عورت کی تھی جس کو اپنی آواز پر پورا پورا قابو تھا۔ اس دور دراز مقام پر صاف ستھری جرمن زبان میں گانا سُننا میرے لئے تعجب کا باعث تھا۔ یہ آواز عجیب و غریب تھی

اور اس سے وطن کی یاد تازہ ہو رہی تھی۔ اس دور دراز مقام پر کون اس طرح گا نا گا سکتا ہے اور جس کی آواز میں بلا کا لوچ ہے؟ ہر گھر کی آواز پر کان لگاتے ہوئے میں آگے بڑھتا گیا اور ایک کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ یوں تو اس مکان کے دروازے چاروں طرف سے بند تھے مگر پھر بھی ہر طرف سے اندر جانے کی انوکھی دعوت کا احساس ہوتا تھا۔ آخر کار میں مکان کے قریب پہنچ گیا۔ یہی مکان تھا۔ چند سیکنڈ کے لئے تو میں خاموشی سے کھڑا سوچتا رہا اور اس کے بعد اپنے کندھے سے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا اور میں نے دروازے پر ٹنگے ہوئے پردے کو ایک طرف کھسکا دیا۔ یکایک میں قریب کھڑے ہوئے ایک شخص سے ٹکرا گیا جس کا چہرہ لالٹین کی روشنی میں کرخ معلوم ہو رہا تھا، اس کی آنکھیں شعلہ بار تھیں۔ پہلے تو وہ کچھ عجیب آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا پھر جلد ہی معافی مانگ کر ایک طرف کھسک گیا اور فوراً ایک گلی میں غائب ہو گیا۔

"عجیب گاہک ہے یہ بھی" میں نے اس کو گھورتے ہوئے سوچا۔ اس کے بعد گانے کی آواز اور بھی واضح ہوتی گئی۔ پہلے سے بھی زیادہ۔ میں بے دھڑک اندر چلا گیا۔

میرے اندر گھستے ہی گانا اس طرح ختم ہو گیا جیسے کسی نے دھاگے کو چاقو سے کاٹ دیا ہو۔ میرے اردگرد سکوت چھا گیا اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے آنے سے وہاں خلل ہوا ہو۔ دھیرے دھیرے میری آنکھیں اس مدھم روشنی پر جمنے لگیں۔ یہ ایک معمولی سا کمرہ تھا جسکے ایک کنارے پر شراب کی چند بوتلیں اور دو چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ غالباً یہ گاہکوں کے انتظار کے لئے ہو گا۔ اس تجارت کی نوعیت کا اندازہ کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا، اس لئے کہ کچھ فاصلہ پر دوسرے کمروں کے دروازے تھے۔ جوان کے اندر بچھے ہوئے پلنگ کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ ان کمروں میں مدھم روشنی کی لالٹینیں جل رہی تھیں۔ قریب ہی ایک لڑکی اپنی کہنیاں میز پر ٹکائے ہوئے بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے بناؤ سنگھار پر خاص توجہ دی تھی مگر بظاہر کافی تھکی نظر آ رہی تھی۔ بار کے پیچھے ایک معمر ہوئی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک دوسری لڑکی جو پہلی سے کم قبول صورت نہ تھی بیٹھی نظر آئی۔ میرے سلام کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑا اور چند منٹ تک مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ ایسی خاموش جگہ پر ٹھہرنا مجھے کچھ عجیب سا معلوم ہوا اور میں نے وہاں سے نکل جانے کا ارادہ کر لیا۔ مگر پھر واپس جانے کی کوئی وجہ نہ دیکھ کر

قریب ہی ایک میز پر بیٹھ کر آنے والے حالات کا انتظار کرنے لگا۔

اپنی تجارت کا خیال آتے ہی لڑکی اپنی جگہ سے اُٹھی اور قریب آ کر اُس نے پوچھا کہ مجھے کیا چاہیے۔ اس کی ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی انداز سے میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ یقیناً جرمن ہے۔ میں نے اُسے بیئر لانے کا آرڈر دیا جس کو وہ فوراً لے آئی اور میرے قریب بیٹھ کر بیئر ہلانے لگی۔ اُس کے بعد وہ دوسرا گلاس بھی لے آئی۔ اس نے اپنا گلاس اُٹھا کر میری طرف ایک انوکھی ادا سے دیکھا حالانکہ اس کی نظریں کہیں اور جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اُس پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ وہ واقعی اب بھی بڑی خوب تھی۔ مگر اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اندرونی آگ کے ٹھنڈے پڑ جانے کی وجہ سے ہو؟ اس کے بال دونوں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ ہونٹ مُرجھائے سے تھے۔ اُس کے کپڑے بھی بڑے عجیب تھے اور شراب اور سگریٹ کی وجہ سے اس کی آواز بھرّائی ہوئی تھی۔ آج میں ایک ایسی عورت کو دیکھ رہا تھا جو دراصل مُردہ تھی مگر جسے اپنی مرضی کے خلاف کافی دنوں سے زندہ رہنا پڑ رہا تھا۔ میں نے اس گھبراہٹ اور پریشانی کے بارے میں اس سے کئی سوال کر ڈالے جس کا جواب اُس نے بڑی بے اعتنائی سے دیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے اُسے میرا یہاں آنا بہت ناگوار گذرا ہو۔ معمر عورت ایک کونے میں بیٹھی ہم دونوں کو گھور رہی تھی اور اس کے قریب دوسری لڑکی اس طرح بیٹھی تھی جیسے وہ میرے اشارے کا انتظار کر رہی ہو۔ اگر میں یہاں بیٹھنے سے پہلے ہی چلا جاتا تو اور بات تھی مگر اب میں تجسس اور شوق کی زنجیر میں جکڑ گیا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ ان تمام باتوں کی وجہ جان کر ہی دم لوں۔

میرے قریب بیٹھی ہوئی عورت اچانک زور سے قہقہے لگانے لگی۔ ٹھیک اسی وقت کمرے میں ہوا کے جھونکے سے لالٹین کی لو تھرتھرا اُٹھی۔

"آخر تم پھر آگئے" لڑکی نے جرمن زبان میں کہا "پھر اسی گھر کا چکّر۔ اچھا آجاؤ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی"

میں نے پہلے عورت کے چہرے کو دیکھا جس کی آنکھیں شعلہ بار ہو رہی تھیں پھر دروازے کی طرف نظر ڈالی جہاں وہی شخص کھڑا تھا جو میرے اس کمرے میں

داخل ہوتے ہی نکل بھاگا تھا۔ اس کا طور طریقہ بالکل انوکھا تھا۔ اس کا طور طریقہ بالکل انوکھا تھا اور وہ فقیروں کی طرح ایک ہاتھ میں ہیٹ لیئے کھڑا تھا۔ وہ ان جملوں سے یک بیک سہم گیا۔ لڑکی کے قہقہے سے وہ اور بھی بوکھلا گیا۔ دوسری طرف بوڑھی عورت اپنے قریب بیٹھی ہوئی لڑکی سے کان میں کچھ کہہ رہی تھی۔

"جاؤ اور فرانکا کے قریب بیٹھ جاؤ۔ دکھائی نہیں پڑتا کیا کہ میرے قریب ایک معزز گاہک بیٹھا ہوا ہے؟"

یہ بات اس نے صاف جرمن زبان میں کہی تھی۔ پاس بیٹھی ہوئی وہ معمر عورت اور دوسری لڑکی ہنستے ہنستے دوہری ہوئی جا رہی تھیں۔ اس شخص کی زبان ہی بند ہو گئی تھی۔

"فرانکا اسے قیمتی شراب کی ایک بوتل دے کر چلتا کر دو" میرے قریب بیٹھی ہوئی عورت نے کہا۔ "اور اگر یہ تمہارے لئے بہت قیمتی ہو تو بھی باہر جا کر بیٹھو اور ہم لوگوں کو پریشان مت کرو۔ تم مجھے مفت حاصل کرنا چاہتے ہو یہ میں ٹھیک سے جانتی ہوں مگر تمہیں کبھی کچھ نہیں مل سکے گا او وحشی درندے!"

وہ عورت اپنی اس حرکت کی وجہ سے عجیب لگ رہی تھی۔ وہ شخص کسی پٹے ہوئے "کتے" کی طرح کانپ رہا تھا اور کانپتے ہاتھوں سے گلاس میں شراب انڈیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ویسے وہ گالی دینے والے کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ذلت کی وجہ سے اس کی آنکھیں فرش سے اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا جوڑ جوڑ الگ ہو گیا ہو۔ وہ حد درجہ اداس اور پریشان نظر آ رہا تھا۔

"آپ اس کی فکر نہ کریں" میرے قریب بیٹھی عورت میری طرف مخاطب ہوئی اور میرے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیں جیسے وہ مجھے ان باتوں سے کہیں دور لے جانا چاہتی ہو۔ "یہ میری اور اس کی بہت پرانی کہانی ہے۔ اس کی ابتدا صرف کل پر نہیں ہے۔" اس نے غصے سے اپنے دانت پیسے اور پھر اس شخص کی طرف متوجہ ہو کر بولی "ذلیل کتے میں جو کچھ کہہ رہی ہوں خاموشی سے سن۔ میں سمندر میں کود کر جان دے دینے کو تیرے ساتھ جانے سے بہتر سمجھتی ہوں۔ سمجھا؟"

دوسری طرف پھر کئی قہقہے بلند ہوئے جیسے یہ سب کی مشترکہ تفریح ہو۔ اس کے بعد

پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ دوسری لڑکی نے اُٹھ کر اس شخص کے چہرے پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔ اب اس شخص کو کچھ تسلّی ہوئی اور اس نے میری طرف نظر اُٹھائی۔ میرے قریب بیٹھی ہوئی عورت نے فوراً اُچھل کر اپنی جگہ چھوڑ دی جیسے ابھی نیند سے بیدار ہوئی ہو۔ اس کے ہاتھ شدّتِ جذبات سے کانپ رہے تھے۔ میں یہ سب برداشت نہ کر سکا۔ میز پر چند سکّے پھینک کر میں بھی چلنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا مگر اس عورت نے بغل گیر ہو کر میرا راستہ روک لیا اور کہا۔

"اگر یہ آپ کو پریشان کر رہا ہے تو میں اس کمبخت کو گھر سے باہر نکال دوں گی۔ اسے وہی کرنا ہوگا جو میں کہوں گی۔ آئیے ایک گلاس اور شراب پی جائے۔"

اس کے بعد اس نے مجھ سے بڑا پُرخلوص برتاؤ کیا۔ اب میں یہ بات بخوبی سمجھ گیا کہ اس نے یہ سب کچھ اس شخص کو جلانے کے لئے کیا ہے۔ یہ بات اس کی نظروں سے صاف ظاہر ہو رہی تھی اس لئے کہ وہ کنکھیوں سے اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ جب میں نے اس کی محبت اور والہانہ کیفیت پر غور کیا تو عجیب شش و پنج میں پڑ گیا۔ دوسری طرف وہ شخص گرم لوہے کی طرح سُرخ ہو رہا تھا۔ میں اُس پر سے نگاہیں نہ ہٹا سکا۔ یہ بات اس کی نظروں سے صاف ظاہر ہو رہی تھی کہ اُس کے اندر نفرت، رقابت اور غصّے کی آگ بھڑک رہی ہے۔ جب جب وہ لڑکی اس کی طرف دیکھتی وہ سہم جاتا۔ وہ میرے اور قریب آ گئی اور میں سمجھ گیا کہ اب وہ اپنے پیشے کے کھیل کو شروع کرنا چاہتی ہے۔ اُس کے چہرے پر معمولی پاؤڈر اور دوسری خوشبوئیں مہک رہی تھیں۔ میں نے اس کو خود سے دور رکھنے کے لئے ایک سگار نکال لیا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں سگار جلاؤں اس لڑکی کی تیز آواز کانوں میں پڑی۔

"ذرا ماچس ادھر لا او نالائق کُتّے!"

اس بات پر کہ وہ اس شخص کو میرا خادم بنا رہی ہے، میں چونک گیا اور اس سے پہلے کہ وہ ماچس لائے میں نے جلدی سے اپنا سگار خود سُلگا لیا مگر اس کا حکم پا کر وہ شخص چاروں طرف دیا سلائی تلاش کرنے لگا۔ میری نگاہیں اس سے ٹکرائیں اور وہ مارے غیرت کے زمین میں گڑ سا گیا۔ اس کے بعد مجھ میں اس کے لئے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ میں نے اس سے جرمن زبان میں کہا۔ "شکریہ آپ نے بیکار تکلیف کی۔" میں نے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ پہلے تو وہ ذرا ہچکچایا مگر پھر اپنے ہاتھوں میرا

ہاتھ جکڑ لیا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لئے شکر گذاری جھلک رہی تھی مگر پھر اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ اخلاقی طور پر میں نے چاہا کہ اس سے بیٹھنے کی درخواست کروں مگر اس کے قبل کہ میں اس سے کچھ کہوں میرے قریب بیٹھی ہوئی عورت بول پڑی۔

"جاؤ اپنی جگہ پہ بیٹھو اور ہم لوگوں اور ہم لوگوں کے قریب مت آؤ۔"

میں اس کے اس سخت رویے اور کرخت آواز کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ میں نے سوچا کہ اس عورت کے اس جنجال میں خود کو پھنسانے اور ذہن کو پریشان کرنے سے اچھا ہے کہ یہاں سے بھاگ جاؤں۔ میں نے جیب سے کچھ سکے نکال کر اس کو دے دئے اور باہر جانے لگا۔ حالانکہ اس بار پھر اس نے بڑی محبت سے مجھے روکنے کی کوشش کی مگر میں نہ رُکا۔ میں اس شخص کی بے عزتی نہ برداشت کر سکا اور میں نے اپنے رویہ سے یہ ظاہر کر دیا کہ اس کا حسن میرے لئے کسی کشش کا باعث نہیں ہے۔ اس کے چہرے پہ غصّے اور نفرت کے جذبات نمودار ہوئے اور سخت الفاظ اس کے ہونٹوں تک آئے۔ مگر اس نے خود پہ قابو پا لیا اور خاموش رہی اور صرف اس شخص کو نفرت اور غصّہ سے دیکھتی رہی۔ اس پر اس نے جلدی ہی اپنے پرس میں ہاتھ ڈالا، اس لئے کہ وہ اس عورت کے سامنے اکیلا نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس نے چند سکّے نکالنے کی کوشش کی مگر اس کے رویّے سے صاف ظاہر ہو گیا کہ اسے پیسہ خرچ کرنے کی عادت نہیں ہے۔ وہ ان لوگوں کی طرح نہیں ہے جو بخوشی اپنا روپیہ لٹاتے پھرتے ہیں۔ اس شخص کی عادت روپیہ خرچ کرنے سے پہلے کئی بار اسے گننے کی تھی اور دونوں انگلیوں کے بیچ اُسے دیر تک دبائے رکھنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اسی طرح آج بھی وہ اس شراب کی قیمت دے رہا تھا۔

"دیکھئے اپنے پیسوں سے جُدا ہوتے وقت وہ کس طرح کانپ رہا ہے۔" اس عورت نے طنزیہ کہا اور اس کے قریب آتے ہوئے بولی "بڑا ہی سست ہے۔ رُکئے میں ابھی......"

وہ مارے ڈر کے کانپنے لگا۔ جب اس نے اس کے سہمے ہوئے چہرے کو دیکھا تو اس کا شانہ ہلاتے ہوئے اس پر حقارت کی نظر ڈال کر بولی "میں تمھاری جیب سے کچھ نہیں نکالوں گی بلکہ میں تمہارے روپیوں پر تھوک دوں گی۔ میں جانتی

ہوں کہ تم نے اپنی ہر کوڑی سیکڑوں بار گن کر رکھی ہے۔" اور اس کے بعد اس کے سینے پر مکہ مارتے ہوئے بولی "مگر کاغذ کا وہ ٹکڑا کہاں ہے جسے تم نے اپنے کوٹ میں بڑی حفاظت سے چھپا رکھا ہے؟"

اس شخص نے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھا۔ اس کا چہرہ غیرت سے پیلا ہو رہا تھا۔

"کنجوس!" وہ چلائی۔

اس پر وہ شخص مڑا اور اس نے اپنا پورا پرس نوجوان لڑکی کی گود میں انڈیل دیا اور اس طرح بھاگ کھڑا ہوا جیسے اس جگہ پر آگ لگ گئی ہو۔ پہلے تو وہ لڑکی چلائی مگر پھر اس کی اس حرکت پر زور زور سے ہنسنے لگی۔

میرے قریب بیٹھی ہوئی عورت کچھ دیر خاموشی سے بیٹھی رہی، اس کی آنکھوں میں غصہ جھلک رہا تھا۔ اس کے بعد اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ تھکی تھکی دکھائی دینے لگی۔ میرے چاروں طرف عجیب سی خاموشی پھیل گئی۔

"اب وہ اپنے روپے کے خرچ ہونے پر افسوس کر رہا ہو گا۔ شاید وہ پولیس اسٹیشن پر رپورٹ بھی کر دے کہ ہم لوگوں نے اس سے روپے زبردستی چھین لئے ہیں۔ کل وہ پھر یہاں آئے گا مگر وہ مجھے کسی قیمت پر حاصل نہ کر سکے گا۔ ہرگز نہیں۔ میں خود کو کسی کے سپرد کر سکتی ہوں مگر اس کے پاس کبھی نہیں جاؤں گی۔"

وہ بار میں گئی اور برانڈی کا گلاس لے آئی۔ اس کی عیاری اب بھی جھلک رہی تھی فرق صرف اتنا تھا کہ اب اس کی آنکھوں میں آنسو کی جھلک پیدا ہو گئی تھی میں نے ایک بار پھر اس پر نظر دوڑائی۔ اب میرا سکون ختم ہو چکا تھا۔

"شب بخیر" میں اتنا کہہ کر وہاں سے چل پڑا۔

"شکریہ" میزبان عورت نے میری طرف دیکھے بغیر کہا اور واپس آتے ہوئے مجھے ہنسی اور قہقہے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

جیسے ہی میں نے گلی میں قدم رکھا مجھے احساس ہوا کہ تمام راہیں حد درجہ تاریک ہیں۔ آسمان پر ستارے بھی غائب تھے مگر ذرا دیر بعد چاند نکل آیا اور اب راستہ تھوڑا تھوڑا نظر آنے لگا۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ اس کے بعد میرا

سارا خوف دور ہو گیا۔ اب میں پھر ایک بار انسان کی قسمت کی پیچیدگی۔ اس کے آنسو پر غور کرنے لگا۔ مجھے ایسا احساس ہوا جیسے ہر دروازے کے پیچھے ایک انوکھا تجربہ کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ جیسے غور کرنے والوں کے لئے ہزاروں تجربے اس دنیا میں بکھرے پڑے ہوں۔ میری خواہش تھی کہ میں اس انوکھے تجربے کو سنہرے خواب میں تبدیل کر دوں۔ میں نے اپنی نگاہ سڑک اور گلی پر چاروں طرف ڈالی اور اپنے ہوٹل کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ اچانک مجھے اپنے راستے پر ایک سایہ نظر آیا۔

"معاف کیجئے گا جناب۔" ایک جانی پہچانی آواز میری مادری زبان میں میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "مجھے ڈر ہے کہ آپ اکیلے اپنے ہوٹل نہ پہنچ سکیں گے۔ کیا میں آپ کی رہنمائی کر سکتا ہوں؟ آپ کا قیام کس ہوٹل میں ہے؟"

میں نے اسے اپنے ہوٹل کا نام بتا دیا۔

"ہاں میں اس ہوٹل کا راستہ ٹھیک سے جانتا ہوں۔" اس نے بڑی خاکساری سے کہا۔

میرے جسم میں جھرجھری سی آنے لگی۔ یہ بڑی خوفناک بات تھی کہ یہ حیوان نما انسان میرے ہمراہ چلے۔ پچھلی ساری باتیں مجھے یاد آنے لگیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس شخص کی بات چیت میں اب بھی بہت انکساری ہے۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا ہے مگر اُس کی زبان لڑکھڑا جاتی ہے۔ میں ارادی طور پر اس شخص کی باتوں میں دلچسپی نہیں ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ وہ بولنے کی بڑی کوشش کرتا مگر اس کا گلا رندھ جاتا۔ اور اب غیر دلچسپ طور پر مجھے اُس کی مدد کرنا ضروری ہو گیا۔ مگر میں نے اس کی اس سلسلے میں کچھ مدد نہیں کی بلکہ اپنے اور اس کے درمیان خاموشی کا پردہ حائل رکھنا مناسب سمجھا۔ میرے بھاری بھرکم قدموں کی چاپ کے مقابلے اس کی چال بڑی دھیمی معلوم ہو رہی تھی۔ میری اور اس کی روح کا تناؤ ہر لمحہ زوردار ہوتا گیا۔ آخر کار اس نے خاموشی کی زنجیر کو توڑ ہی دیا اور بولنا شروع کیا۔

"آپ نے آج بڑی انوکھی بات دیکھی ہے۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں، اس لئے کہ میں اس کا پھر تذکرہ کر رہا ہوں۔ یہ بات آپ کو بڑی عجیب و غریب معلوم ہو رہی ہوگی اور آپ مجھے غیر مہذب آدمی سمجھ رہے ہوں گے، مگر آپ خود ہی غور کیجئے جناب .... وہ عورت۔

"....ہاں.... وہ....."

اُس کی آواز ایک بار پھر پھنس گئی۔ پھر بڑی کوشش کے بعد اس نے جلدی سے کہا۔

"وہ میری بیوی ہے صاحب۔"

میں نے اس کی اس بات پر حیرت ظاہر کرنا ہی چاہا تھا کہ اُس نے اپنی بات شروع کر دی تاکہ وہ اپنی صفائی پیش کر سکے۔

"کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ میری بیوی تھی۔ پانچ.... نہیں چار برس ہوئے گر اس ہم میں جہاں میرا اپنا گھر ہے۔ صاحب اس کے بارے میں کوئی گندی رائے نہ قائم کیجئے۔ اس کی موجودہ حالت کا ذمہ دار میں ہوں۔ وہ ہمیشہ سے ایسی نہیں تھی۔ میں نے... اس کو ہمیشہ تنگ کیا ہے۔ میں نے اس کی غربت کے باوجود اس سے شادی کی۔ شاید اس کے جسم پر ایک چیتھڑا بھی نہیں تھا، کچھ بھی نہیں تھا اور اس کے خلاف میں کافی خوش حال تھا۔ اور اب بھی دولت مند ہوں۔ ہاں شاید وہ ٹھیک ہی کہتی ہے.... میں حد درجہ بخیل تھا۔ اس ناخوش گوار حادثے سے پہلے میری حالت ایسی تھی۔ میں اپنا ایک دھیلا بھی خرچ کرنے سے پہلے سیکڑوں بار سوچتا۔ وہ خوب صورت چیزوں کی بڑی دلدادہ تھی مگر غریب ہونے کی وجہ سے اس کے پاس میری دی ہوئی چیزوں کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ میں ہمیشہ اُسے اُس کی غُربت کا احساس دلاتا۔ اُف اب مجھے معلوم ہے کہ یہ میری بہت بڑی غلطی تھی۔ پہلے میرے پاس اِس بات پر غور کرنے کا کافی موقعہ تھا— وہ بہت مغرور تھی۔ حد درجہ مغرور۔ آپ قطعی طور سے یہ خیال اپنے دل سے نکال دیجئے کہ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی جیسا آپ نے اُسے آج دیکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف مجھ کو شرمندہ کرنے کی خاطر اُس نے آج اس طرح کی حرکت کی ہے۔ چونکہ وہ اپنی حرکت پر خود ہی شرمندہ ہے اس لئے وہ مجھے بھی ایذا پہنچانا چاہتی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اب بُری ہو گئی ہو۔ نہیں... مجھے اس کا یقین نہیں ہے۔ اس لئے کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ پہلے کتنی نیک تھی۔"

شدّتِ جذبات کی وجہ سے اُس کی چال اور اندازِ بیان دونوں میں نمایاں فرق پیدا ہو گیا تھا۔ اور وہ کبھی کبھی اپنے آنسو بھی پونچھتا جاتا۔ میں کبھی کبھی اُس کی طرف دیکھ لیتا۔ اب مجھے وہ قابلِ تفریح آدمی نہیں لگ رہا تھا۔ اور مجھے اس کی موجودگی سے گھبراہٹ کے بجائے ہمدردی پیدا ہو چلی تھی۔ اس نے اپنی دلی کیفیت بیان کرنے کا

جو طریقہ اپنایا تھا وہ حد درجہ موثر تھا۔ اب ہم لوگ پھر آگے بڑھنے لگے۔ اس نے اپنی نگاہیں نیچے ہی رکھیں جیسے راستے پر اپنی داستان پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایک بار اس نے گہری سانس لی اور پھر اپنی کہانی شروع کر دی۔

"ہاں صاحب! وہ بہت نیک تھی اور مجھ پر برابر مہربان رہتی تھی۔ وہ میری اس بات پر شکر گذار تھی کہ میں نے اسے دُکھ اور غریبی کے کیچڑ سے نکال کر آرام دہ زندگی عطا کر دی ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ شکر گذار ہے مگر پھر بھی یہ بات میں برابر اُس کے مُنہ سے سُننا چاہتا تھا۔ جناب! یہ بات تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہر شخص کی یہ چھُپی ہوئی خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے اس کو اس کی حیثیت سے زیادہ اچھا کہیں ـــ اور شاید اگر وہ اسی طرح برابر میری طرف داری کرتی رہتی تو میں نے اپنی ساری دولت اس پر صرف کر دی ہوتی مگر اس کا اپنا غرور بھی کچھ کم نہ تھا۔ اسی لئے کبھی کبھی وہ میری تعریف کرنے میں ہچکچاتی۔ مگر میں برابر اسے مجبور کرتا کہ وہ مجھ سے ہر چیز کی درخواست کرے۔ یہ تکلیفیں اٹھاتے ہوئے اسے تین برس گذر گئے اور اب اس کا مزاج بھی بدلنے لگا۔ مگر آپ اس بات کا یقین نہ کریں گے کہ یہ سب صرف اس لئے ہوا کہ میں اُس سے والہانہ محبت کرتا تھا میں اس کے ناز اور نخرے بھی برداشت کرتا مگر پھر بھی اس کو کمتر ظاہر کرنے کی کوشش باز نہ آتا۔ میں بھی کتنا بے وقوف تھا۔ جب کبھی وہ مجھ سے کسی چیز کی خواہش ظاہر کرتی تو میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا جیسے مجھے اُس کی اِس بات سے تکلیف ہو رہی ہے حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ میں مارے خوشی کے ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا ـــ مگر پھر بھی اُسے نیچا دکھاتا۔ ان دنوں مجھے اس بات کا احساس نہیں رہ گیا کہ میں اسے کتنا چاہتا تھا۔"

اب وہ پھر خاموش ہو گیا اور چال بھی دھیمی کر دی۔ اب شاید وہ میری موجودگی بھی بھول گیا تھا اور خود ہی اپنے آپ کو مخاطب کرنے کے انداز میں بول رہا تھا۔

"مجھے اس سے کتنی محبت ہے اس بات کا احساس مجھے اُس دن ہوا ـــ اُس منحوس دن ـــ جس دن اُس نے مجھ سے کچھ روپے اپنی ماں کی مدد کے لئے مانگے اور میں نے انکار کر دیا۔ یہ بڑی معمولی سی رقم تھی اور در اصل یہ رقم میں نے اس کے لئے الگ بھی کر دی تھی مگر چاہتا یہ تھا کہ وہ مجھ سے پھر مانگے ـــ اُس کے بعد ـــ جب میں واپس آیا تو وہ غائب تھی اور میز پر ایک مختصر سا خط پڑا تھا۔ اُس نے صرف

اتنا لکھا تھا۔ "اپنے روپے اپنے پاس رکھو۔ میں تم سے کبھی ایک کوڑی بھی نہ مانگوں گی۔"
بس صرف اتنا اور کچھ بھی نہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں تین دن کا بھوکا پیاسا ہوں۔
میں نے ایک ایک چپہ اس کی تلاش میں چھان مارا اور اس کا پتہ لگانے کے لئے ہزاروں روپے
خرچ کر دئے۔ یہاں تک کہ میں نے اپنی پریشانی اپنے پڑوسیوں پر بھی ظاہر کر دی مگر وہ مجھے
تنگ کرنے کے لئے ہنستے رہے۔ ایک مدت تک اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ چند ماہ بعد
معلوم ہوا کہ برلن جانے والی گاڑی میں کسی سپاہی کے ہمراہ دیکھی گئی ہے۔ میں اپنی تجارت
چھوڑ کر اسی دن وہاں پہنچ گیا۔ اس طرح مجھے ہزاروں کا نقصان ہوا۔ میرے مزدور، نوکر
اور منیجر سب نے میری عدم موجودگی میں اپنی جیب بھری۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ مجھے اس کی
کوئی پرواہ نہ تھی۔ میں برلن ایک ہفتہ ٹھہرا رہا اور آخر کار میں نے اُسے پا ہی لیا۔"

اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر اپنی بات جاری رکھی۔

"میں آپ سے سچ کہتا ہوں میں نے اس سے ایک بھی سخت جملہ نہیں کہا۔ میں
رونے لگا — اور اس کے قدموں پر گر پڑا اور اُس کی ہر خواہش پوری کرنے کو تیار
ہو گیا — اب وہ میری تمام چیزوں کی مالک تھی — اس لئے کہ اس وقت مجھے اس بات
کا احساس ہو چلا تھا کہ میری زندگی اس کے بغیر ادھوری ہے اور میں اس کے بغیر زندہ
نہ رہ سکوں گا۔ میں اس کے رُوئیں رُوئیں سے پیار کرتا تھا، اس کے چہرے سے، اس کی
صورت سے اور اس کی ہر چیز سے — میں نے اس کی مالک مکان عورت (جو در اصل
سفید غلاموں کی تاجر تھی)، کی مٹھی بھی گرم کر دی تاکہ میں لڑکی سے اکیلے میں بات کر سکوں۔
اس کا چہرہ بالکل سفید ہو گیا تھا مگر اس نے میری ہر بات خاموشی سے سُنی۔ اس کا انداز
کچھ ایسا تھا جیسے اسے میرے آنے سے واقعی بڑی خوشی ہوئی ہو۔ اس کے بعد میں نے
اس سے پوچھا کہ اس کے پاس خرچ کرنے کے لئے اتنے روپے کہاں سے آئے۔ دیکھئے نا
مجھے آخر اس بات کا توحق تھا ہی کہ میں ذاتی طور پر اس سے یہ بات پوچھوں۔ مگر اس نے
اس بات کے جواب میں ایک گمنام آدمی کا نام لے لیا اور وہ دونوں مجھ پر پھر ہنسنے لگیں۔
میں نے اسے کبھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا اور ہر روز وہاں جاتا رہا۔ چند دنوں
بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ شخص اسے چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے اور اب اس کا کوئی سہارا نہیں ہے۔
اس لئے میں نے اس سے واپس چلنے کے لئے کہا اور بہت سے روپے بھی دے دئے۔

مگر اس نے سارے نوٹ پھاڑ ڈالے اور پھر جب دوسرے دن میں وہاں واپس آیا تو وہ جا چکی تھی ـــ صاحب آپ بھلا اس بات کا کیسے اندازہ کر سکیں گے کہ میں نے اس کو پھر تلاش کرنے کے لئے کیا نہیں کیا۔ میں سال بھر اس کے چکر میں پھرتا رہا اور ہر جگہ ایجنٹوں کو اس کا پتہ لگانے کے لئے روپے دیتا رہا۔ آخر کار مجھے پتہ چلا کہ وہ ارجنٹائنا چلی گئی ہے اور . . . ایک . . . "بدنام جگہ" . . . میں ہے۔

اب وہ پھر ہچکچایا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دونوں لفظ اس کے گلے میں چپک گئے ہوں۔ کسی طرح پھر اس نے بات جاری رکھی۔

"پہلے تو مجھے اس بات کا یقین نہیں آیا۔ پھر میں نے سوچا کہ اس کی ساری ذمہ داری مجھ پر ہے اس لئے کہ میں نے ہی اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اس کے بعد سوچا کہ اسے کتنی تکلیف اُٹھانی پڑتی ہوگی۔ وہ جو اتنی نخوت پسند ہے۔ میں نے اپنے وکیل سے اس کو روپے بھیجنے کو کہا تاکہ وہ میرے پاس واپس آجائے۔ میری ہوئی رقم اُس کے میرے پاس واپس آنے کے لئے بہت کافی تھی۔ میری ترکیب کامیاب اور مجھے تار ملا کہ اس کا اسٹیمر فلاں تاریخ کو امسٹرڈم پہنچ رہا ہے۔ میں اتنا بیقرار تھا کہ تین روز قبل ہی وہاں پہنچ گیا اور جب میں نے اسٹیمر کا دھواں دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں مارے خوشی کے بے ہوش ہو جاؤں گا۔ اسٹیمر کے بندرگاہ تک پہنچنے کا انتظار میرے لئے بہت طویل ہو گیا۔ جب میں نے اس کی جھلک دیکھی تو مجھے یقین نہ آیا۔ اس نے بہت بناؤ سنگھار کر رکھا تھا۔ اُس نے مجھے انتظار کرتے دیکھا تو بے قرار ہو کر جلدی سے آگے بڑھی اور اگر دو ملاح اُسے سہارا نہ دیتے تو شاید وہ گر پڑتی۔ جیسے ہی اس نے سیڑھی پر قدم رکھا میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ میرا گلا اس قدر رندھ گیا تھا کہ میں کچھ نہ بول سکا۔ اس نے بھی کچھ نہیں کہا اور نہ ہی نگاہ اُٹھائی۔ میں نے ایک قلی سے سامان ہوٹل میں لے چلنے کو کہا۔ اس کے بعد وہ میری طرف مخاطب ہوئی ـــ اُفوہ صاحب! کاش آپ اس کی وہ رُندھی ہوئی آواز سُن لیتے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ "کیا اب بھی تم مجھے اپنی بیوی بنانا چاہتے ہو جب کہ؟ . . ." میں نے اُس کے نرم نرم ہاتھوں کو بھینچ لیا۔ وہ کانپ گئی مگر مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ میں نے سوچا کہ جلدی ہی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ـــ آہ!

میں کتنا خوش تھا۔ جب ہم اپنے کمرے میں پہنچے تو میں مارے خوشی کے ناچنے لگا۔ اُس کے پیروں پر جھک کر عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگا۔ مجھے خیال آتا ہے کہ میں نے بہت سی بچکانہ حرکتیں کی تھیں اس لئے کہ وہ اپنے آنسوؤں کے باوجود میری ان باتوں پر ہنسے بغیر نہ رہ سکی تھی اور کچھ جھجکتے ہوئے میرے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگی —— اُس کی محبت کا مجھ پر بہت اثر ہوا اور میرا دل مسرّت سے سرشار ہوگیا۔ میں اوپر سے نیچے دوڑتا رہا اور طرح طرح کے کھانے کا آرڈر دیتا رہا —— میں نے اسے اپنی شادی کی دعوت کا نام دے دیا۔ میں نے اسے کپڑے تبدیل کرنے میں مدد دی۔ پھر ہم دونوں نیچے گئے اور اعلیٰ درجہ کا کھانا کھایا۔ وہ بالکل بچوں جیسی لگ رہی تھی۔ بھولی اور پیاری —— پھر ہم دونوں اپنے مستقبل اور گھر کے بارے میں باتیں کرنے لگے، تب ——"

اس کی آواز ایک بار پھر لڑکھڑائی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی کا گلا گھونٹنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"اسی وقت ۔ ۔ ۔ ۔ ویٹر ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ذلیل انسان جس نے شاید مجھ کو نشے میں بالکل دُھت سمجھ لیا تھا کیونکہ میں خوشی کے مارے بہت دیر سے زوردار قہقہے لگا رہا تھا اور کافی مسرور تھا۔ از حد خوش ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اُسے بل کے پیسے دئے اور اس نے مجھے نشے میں مست سمجھ کر کافی کم پیسے لوٹائے۔ میں اس کو واپس بلایا اور پورے پیسے لوٹانے کو کہا۔ اس پر وہ بہت شرمندہ ہوا اور بقیہ پیسے پلیٹ میں واپس رکھ گیا۔ اسی وقت یکایک ۔ ۔ ۔ لڑکی بڑے زور سے ہنسنے لگی۔ میں حیران ہو کر اُسے دیکھتا رہا۔"

اس کا رویہ اب بالکل بدل گیا تھا۔ سخت جھنجھلایا ہوا اور ناراض سا۔

"تم نے پھر وہی حرکت کی۔ شادی کی دعوت کے وقت بھی۔" اس نے سادگی سے کہا۔ اُس کی آواز میں بلا کی ہمدردی تھی۔ مجھے اپنی اس حرکت پر بڑا غصہ آیا۔ میں نے ہنسی میں معاملہ رفع کرنا چاہا مگر اس کے چہرے کے سادہ نقوش اب بگڑ چکے تھے۔ —— اس نے وہ رات الگ کمرے میں بسر کرنے پر زور دیا۔ میں اُس کی ہر خواہش پورا کرنے کے لئے تیار تھا۔ میں اکیلے کمرے میں خاموشی سے لیٹا ہوا سوچتا رہا کہ صبح اُٹھ کر اس سے کیا کیا باتیں کروں گا۔ اس کے لئے کوئی قیمتی تحفہ خرید لاؤں گا تاکہ رات کا خیال اس کے دل سے مٹ جائے۔ دوسری صبح میں باہر نکل پڑا اور اس کے لئے ایک

خوب صورت اور قیمتی نکلس خرید لایا۔ ۔ ۔ ۔ اس کے بعد میں اس کے کمرے میں گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
مگر ۔ ۔ ۔ مگر ۔ ۔ ۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ وہ وہاں سے جا چکی تھی ۔ میں نے چاروں طرف
نگاہ دوڑائی کہ شاید اس کی کوئی تحریر ہی نظر آجائے ۔ کمرے کے ایک کونے میں مجھے کاغذ
کا ایک ٹکڑا نظر آگیا۔ اس پر صرف اتنا لکھا تھا۔

"مجھے سکون سے زندہ رہنے دو۔ تمہاری حرکتوں سے مجھے حد درجہ تکلیف پہنچی ہے۔"

ہم لوگ اب بندرگاہ کے قریب پہنچ گئے تھے اور ساحل کا شور اب ہم لوگوں کو
صاف سُنائی دے رہا تھا۔ پانی کے جہاز جانوروں کی آنکھوں کی طرح چمک رہے
تھے۔ مجھے دور سے پھر کسی کے گانے کی آواز سُنائی دی مگر آواز واضح نہ تھی۔ ساری
بستی کے لوگ محوِ خواب تھے اس لئے کہ اب کافی رات ہو گئی تھی۔ روشنی میں میرے
ساتھ چلنے والے شخص کا سایہ کبھی سمٹ کر چھوٹا ہو جاتا اور کبھی بھوت کی طرح لمبا۔ میں
اس وقت نہ کچھ بولنا چاہتا تھا نہ اُسے تسلّی دینا چاہتا تھا اور نہ ہی اس سے کوئی سوال
کرنا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود خاموشی میرے لئے حد درجہ تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی۔
اچانک اُس نے میرے دونوں ہاتھ زور سے پکڑ لئے اور بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔

"اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کو ساتھ لئے بغیر یہ جگہ نہ چھوڑوں گا۔ میں نے
کئی ماہ کی مسلسل تلاش کے بعد اس کا پتہ لگایا ہے۔ اب میں کچھ سوچ نہیں سکتا۔ میں
آپ سے گذارش کرتا ہوں کہ آپ اس سے چند باتیں کر لیں ۔ وہ مجھ سے ٹھیک سے
بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔ میں اُسے واپس بلانا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اس سے اتنا
بھی نہیں کہہ سکتے ؟ مہربانی کر کے صرف اتنی بات کر دیجئے۔ اب میں یہ قطعی برداشت نہیں
کر سکتا کہ اجنبی لوگ اس کے پاس جائیں ۔ وہ خود کو ان کے سپرد کرے اور میں گلی
میں ان لوگوں کی واپسی کا انتظار کروں۔ ہنستے ہوئے مسرور لوگ ــــ اب اس بستی
کا ہر شخص مجھے پہچان گیا ہے اور سب لوگ مجھے راہ پر بیٹھا دیکھ کر مذاق اُڑاتے ہیں۔
میں پاگل ہو جاؤں گا اگر اس پر پہرہ جاری رکھوں گا ۔ ۔ ۔ ۔ صاحب میں آپ کے
پیر پڑتا ہوں ۔ آپ اس سے باتیں کر لیجیے۔ آپ یہاں کے لئے اجنبی ہیں مگر پھر بھی میری
خاطر اتنا کر دیجئے ۔ اس کے وطن کا آدمی اس پر بہت کچھ اثر ڈال سکتا ہے۔ آخر وہ
آپ کی ہم وطن ہے۔"

میں نے کوشش کی کہ اس کی گرفت سے اپنے ہاتھوں کو آزاد کرلوں۔ میری ساری ہمدردی میں اب کچھ جھنجلاہٹ شامل ہوگئی تھی۔ اور جب اسے اس بات کا خیال پیدا ہوا کہ میں خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرنے کی فکر میں ہوں تو وہ اسی جگہ بیٹھ گیا اور اس نے میرے پیر پکڑ لئے "میں آپ کو قسم دیتا ہوں، آپ اتنا ضرور کر دیجئے۔ کسی بھی طرح ورنہ اب میں کچھ نہ کچھ ضرور کر بیٹھوں گا . . . میری ساری دولت اس کو تلاش کرنے میں صرف ہو چکی ہے۔ اب میں اسے کسی قیمت پر نہ چھوڑوں گا۔ کم از کم زندہ تو کبھی نہیں . . . میں نے ایک چاقو خرید لیا ہے۔ ہاں صاحب! ایک بہت بڑا چاقو . . . اب میں اُسے یہاں نہ رہنے دوں گا چاہے کچھ بھی ہو، چاہے مجھے اس کا خون ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اب میں کچھ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں آپ سے اب بھی درخواست کرتا ہوں — اسے سمجھا دیجئے، ورنہ . . . . "

وہ میرے سامنے تصویر بن کر کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت اس سڑک پر دو سپاہی گزرے۔ میں نے خود کو اس سے آزاد کر لیا۔ ایک بار اس نے مجھے خالی نظروں سے دیکھا پھر دھیمی آواز میں بولا "دائیں طرف مُڑ جائیے، تھوڑی دور آگے آپ کا ہوٹل ہے"۔

ایک بار پھر اُس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ اُس کی پتلیاں بالکل سفید اور بے جان دکھائی پڑ رہی تھیں۔ اس کے بعد وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

مجھے اتنی سردی لگ رہی تھی کہ میں نے اپنا کوٹ پہن لیا۔ میں بری طرح تھک بھی چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مجھ پر نشہ سا طاری ہے۔ ایک گہری نیند، کسی بھی خیال اور تصوّر سے دور . . . میں یہ ساری باتیں سوچنا چاہتا تھا مگر نیند کسی طرح ختم نہیں ہو رہی تھی۔ میں اپنے ہوٹل میں پہنچ کر بستر پر دراز ہو گیا اور گہری نیند میں ڈوب گیا۔

دوسری صبح میں اپنے پریشان خواب کو حقیقت کا روپ دینا چاہا، پھر دل میں ایک خیال پیدا ہوا کہ ان باتوں کی فکر چھوڑ دوں۔ میں آج دیر سے سو کر اُٹھا تھا، نئی جگہ تھی، سوچا لاؤ یہاں کا گرجا گھر دیکھ لوں جو اپنی نقاشی کے لئے مشہور ہے۔ مگر مجھے یہ سب چیزیں قطعی سمجھ میں نہ آئیں۔ رات کے انوکھے واقعات میرے دماغ میں چکّر لگا رہے تھے اور غیر شعوری طور پر میرے قدم اُسی مکان اور اسی گلی کی طرف مڑنے لگے۔

دن کے وقت یہ علاقہ بالکل بیجان معلوم ہوتا ہے مگر اُن لوگوں کے لیۓ نہیں جو اس کی حقیقت جانتے ہیں۔ رات سے قبل اِن راہوں پر زندگی نہیں لوٹ پاتی۔ میں نے بڑی کوشش کی مگر اس خاص سڑک کا پتہ نہ لگا سکا۔ آخر کار مایوس ہو کر میں نے ہوٹل واپس جانے کا ارادہ کیا میرے دماغ میں سارے واقعات کی کڑیاں الگ الگ چکر لگا رہی تھیں۔

وہاں سے گاڑی رات کو نو بجے روانہ ہوتی تھی اور مجھے اسے چھوڑ دینے کا افسوس ہوتا۔ ایک قلی نے میرا سامان اسٹیشن پر پہنچانے کے لیۓ اُٹھایا۔ کراسنگ کے قریب پہنچ کر مجھے اس گھر کو جانے والی سڑک یاد آگئی۔ میں نے اس آدمی کو وہیں رک کر انتظار کرنے کو کہا اور خود واقعات کا آخری روپ دیکھنے کے لیۓ اُسی مکان کی طرف چل پڑا۔

ہاں! یہاں پھر کل کی طرح اندھیرا تھا۔ چاندنی باہری دروازوں اور کھڑکیوں پر جگمگا رہی تھی۔ میں ابھی قریب پہنچ ہی رہا تھا کہ ایک متحرک سایہ نظر آیا۔ میں نے دروازے پر اُسی شخص کی جھلک دیکھ لی۔ اس نے اشارے سے مجھے قریب آنے کو کہا مگر میں مارے خوف کے قریب نہ جا سکا اور وہاں سے بھاگ جانے کا ارادہ کر لیا۔ اوّل تو میں وہاں دیر تک ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ دوسرے مجھے گاڑی چھوٹ جانے کا بھی خوف تھا۔ گلی کے ایک کونے پر پہنچ کر میں نے پھر ایک جھلک دیکھنے کی کوشش کی۔ جب میری نظریں اُس شخص پر پڑیں تو وہ گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے دروازے کو دھکا دے کر کھول دیا۔ اس کے ہاتھ میں دھات کی کوئی چیز چمک رہی تھی۔ کون جانتا ہے کہ اس چاندنی رات میں اتنی چمکیلی چیز کیا تھی — بڑا سا تیز چاقو یا دولت؟ اتنی خوفناک چیز کیا ہو سکتی ہے؟

انور جلال

جینیس کے دوست

اور کہا جینیس نے کہ دوست ملنا اور دوست ہونا ناگزیر ہے اور مجھے یاد ہے جب نپولین نے کہا تھا جب کہ وہ اور اس کی فوج لڑائی میں دشمنوں سے گھری ہوئی تھی کہ 'میرا اعتماد میرا دوست ہے' اور سکندر نے کسی لڑائی کے میدان میں کہا تھا 'میرے سورماؤں کا جذبہ میرا دوست ہے' اور کہا تھا ہٹلر نے کہ 'دوست وہ ہے جو لڑائی میں کام آئے' اور کہا تھا لقمان نے کہ 'بیوقوف میرے دوست ہیں جن سے میں نے عقل حاصل کی۔

"اور تم نے کیا کہا تھا؟" ریاض نے تنگ آکر پوچھا۔

"بیوقوف!" جینیس نے بُرا سا مُنہ بنا کر اسے پیار سے ڈانٹا "بدتمیز! علم حاصل کرنے کے لئے صبر کی ضرورت ہے۔"

ریاض دبک گیا۔ میں نے اور ناصر بھائی نے لُقمہ دیا۔ "پھر بھائی منصور تم اپنی بات جاری رکھو۔"

"تو ہاں!" منصور نے آنکھیں آدھی بند کرلیں اور ایکٹنگ کرتے ہوئے بولا۔ "دوست! دوست!" پھر اس نے بُرا سا مُنہ بنا کر تھوک نگلا اور بھنویں سکوڑ کر آنکھیں بند کیں اور لہجے کو ذرا دھیما کر کے بولا۔ "کہا تھا مہاتما بُدھ نے کہ تمام جاندار میرے دوست ہیں اور رُو رُو کر کہا بھگت کبیر نے کہ آنسوؤں سے زیادہ کوئی دوست نہیں ہے

اور کالی داس مسکرایا۔ "میرے دوست میرے تصوّر ہیں" اور جارج برنارڈ شا نے اپنی سفید داڑھی کھجائی اور چھڑی تھام کر بولا "تصوّر کیا ہوئے؟ الفاظ! میرے دوست میرے الفاظ ہیں اور بائرن نے کالر ٹھیک کیا، اس نے اپنے ہونٹوں پر طنز بھری مسکراہٹ پیدا کی اور کہا غلط! کوئی کسی کا دوست نہیں ہے۔ شراب! شاعری، دولت، کتے اور عورت کوئی بھی کسی کا نہیں ہے۔ انسان خود اپنا دوست ہے۔"

"اور باپو نے کہا۔ "سب بھائی بھائی ہیں۔ ہندو بھائی، سکھ بھائی، مسلمان بھائی۔ ہم سب بھائی بھائی ہیں، ہم سب دوست ہیں۔" اور خلیل جبران نے کہا۔ "مبارک ہیں وہ جھونکے جو لبنان کے گلستانوں میں لہراتے ہیں۔ وہ بہار جو لبنان میں قیام کرتی ہے۔ لوگو اس دنیا کے پھیلے ہوئے میدانوں، پہاڑوں اور بیابانوں میں، چراگاہوں اور گلستانوں میں تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ اگر کچھ ہے تو وہ تمہارے سینے میں ہے۔ روح کی گہرائیوں میں کھو جاؤ تاکہ تم اپنے آپ کو پا سکو۔ روح کا ساتھ عظیم ہے۔ اس کی دوستی لازوال ہے۔"

منصور خاموش ہو گیا اور پھر چیخ کر بولا "جاہل لوگو! اے جہالت کے پوجنے والو! بتاؤ تم نے ان ساری باتوں کا کیا مطلب لیا؟ کیا حاصل کیا؟ نہیں، تم جواب نہیں دے سکتے۔ مجھ سے پوچھو اور میری سنو۔ میں دوست کے لفظ سے دوست کے مطلب سے اور دوست کے وجود سے شرمندہ ہوں۔ اسی طرح جس طرح کتا اپنی دُم سے۔ اونٹ اپنے کوہان سے، درخت اپنے سائے سے اور انسان اپنے وجود سے شرمندہ ہے۔ کتا کتے کا اور انسان انسان کا کبھی دوست نہیں ہو سکتا۔ میرا دوست میرا علم ہے میرا جینیئس ہے۔ اور میں اس میں اور وہ مجھ میں اتنا گھل مل چکے ہیں کہ ہمیں الگ کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔"

"مگر منصور! یہ کتا اونٹ اور درخت کیوں شرمندہ ہیں؟ یہ کیا بات ہوئی؟"

"ہا ہا ہا!" قہقہہ لگا کر منصور شک بھری نظروں سے ہمیں گھور کر پیار سے بولا۔ "نہیں سمجھے؟ کیسے سمجھ سکتے ہو۔ ہر بات سمجھنے کے لئے ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔" اور وہ قہقہے لگانے لگا۔ اور پھر دھیرے سے بولا۔ "کتا اپنی دُم سے اس لئے شرمندہ ہے کہ وہ اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو اس میں وفا نہ ہوتی۔ اور نہ آج وہ اتنا ذلیل ہوتا۔"

"اونٹ اپنے کوبڑ کو لبادوں میں ڈھانک کر اونٹ کے کوبڑ پر طنز کرتا ہے۔"

"درخت بے چارہ اپنے سائے سے شرمندہ ہے صرف اس لئے کہ آدمی سائے کو دیکھ کر وہاں آرام کرتا ہے اور جاتے وقت اس کی شاخیں اور پتے کاٹ کر اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔"

"اور انسان! انسان اپنے وجود سے کب شرمندہ ہے؟ ویسے اسے شرم آنی چاہئے کیونکہ لبادوں کے باوجود وہ اپنا ننگاپن نہیں ڈھانک سکتا۔ بے چارہ انسان!"

"اور تم لوگوں کو علم ہو گا" منصور ایک دم رک گیا، یوں ہی جیسے وہ کوئی جاسوسی کہانی سوچ رہا ہو اور مسکرا کر بولا "تم لوگوں کی صحبت نے آخر مجھ پر بھی اثر کر ہی دیا۔ تم لوگوں کو بھلا علم کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ مسکرانے لگا۔

"مگر منصور!" ناصر بھائی نے کہا۔ "تم سے ملتے اتنا عرصہ ہو گیا۔ اب بھی ہم اس قابل نہیں ہوئے۔"

"نہیں"۔ منصور نے لاپرواہی سے کہا۔ "ارے تو ملنے سے کیا ہوتا ہے۔ بات تو جب ہے کہ میں تم لوگوں سے ملوں اور میں کسی سے نہیں ملتا۔ اگر یہ بات ہو تو تم جیسے جاہل لوگ مجھے گھیرے رکھیں۔ میاں صاحبزادے! میں تم لوگوں سے مل کر، تم لوگوں میں گھر کر بھی اکیلا رہتا ہوں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آج میں منصور نہ ہوتا بلکہ تمہاری جگہ ہوتا اور تم میرا سارا علم سارا جینیس سمیٹ چکے ہوتے۔" منصور شرمانے اور مسکرانے لگا اور پھر چشمہ صاف کر کے بولا۔ "برا ماننے کی بات نہیں بلکہ اس کا شکر ادا کرو جس کو تم عظیم سمجھتے ہو۔" وہ رک کر بولا۔ "میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں، میں کسی پر احسان نہیں کر رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم تھوڑا سا علم حاصل کر لو، مگر یہ تبھی ممکن ہے جب تم میں جہالت کا احساس پیدا ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ مجھ سے مل کر تم میں یہ احساس ضرور جاگتا ہو گا۔ اور اگر یہ واقعی درست ہے تو دنیا چاہے تم سے کسی چیز کی امید رکھے تو بے جا نہ ہو گا مگر تم یہ خیال دل میں کبھی مت لاؤ کہ میں تمہارا دوست ہوں۔" وہ رک کر بولا۔ میں تم لوگوں کو چند خطوط سناتا ہوں، یہ اُن لوگوں کے ہیں جو تمہاری طرح غلط فہمی کا شکار رہیں اور مجھے اپنا دوست سمجھتے ہیں۔" وہ رک گیا اور میز کی دراز ٹٹولنے لگا۔ ایک سیاہ فائل نکال کر اس کا ورق

اُلٹنا شروع کر دیا، پھر چہرے پر طنز کے جذبات پیدا کر کے بولا "لو سنو! یہ خط ایک طالب علم کا ہے۔

"جناب منصور صاحب السلام علیکم۔

کافی ہاؤس میں ایک دن میں نے آپ کو باتیں کرتے سُنا تھا۔ آپ اپنے چند دوستوں کو کافی اور کافی ہاؤس کا مطلب بتا رہے تھے۔ ان کے لباس، اعتقاد اور چال چلن کی بھی تنقید کر رہے تھے۔ میں آپ کی باتوں سے بہت مرعوب ہوا تھا۔ کیا میں آپ کے ساتھ خط و کتابت کر سکتا ہوں؟

فقط

اختر علیم۔ ایک طالب علم"

اور میں نے اس کو صرف یہ لکھا تھا۔

"برخوردار!

جینیس تمہیں معاف کرے۔ غیروں کی بات سننا اخلاقی پستی کا ثبوت دینا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ تم نے ایسی شرمناک حرکت کی۔

فقط

منصور"

ایک اور خط سُنئے۔ یہ خط ایک دُکان دار کا ہے۔

شملہ کلاتھ ہاؤس

ڈیر منصور آداب!

آپ شملہ میں نئے نئے آئے ہوئے ہیں۔ بہر حال میں آپ کو مال روڈ پر کئی بار دیکھ چکا ہوں! ایک دوست نے آپ کا غائبانہ تعارف کراتے ہوئے کہا تھا۔ یہ شخص جینیس ہے۔ میرا بھی آپ کے متعلق وہی اندازہ تھا۔ کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اپنے لباس کی طرف توجہ کیوں نہیں دیتے؟ ایک اتنے خوب صورت ذہن کا آدمی لباس کی طرف سے اتنا بے پرواہ کیوں ہے۔ یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں آپ کو ایک سوٹ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ قبول فرمائیں گے۔

فقط

رام چرن ورما

اس کا جواب بھی سُن لو۔

مسٹر ورما !

میں شملے میں کیا ساری سرزمین پر اجنبی ہوں۔ میں نے تمھیں کبھی نہیں دیکھا ہے اور نہ کبھی غائبانہ تعارف ہی ہوا ہے۔ تم نے جس زبان میں خط لکھا ہے وہ نہایت غیر مناسب ہے۔

میں لباس کو اپنی شخصیت سے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتا۔ تم جو سوٹ مجھے پیش کرنا چاہتے ہو اسے تیار کر کے خود پہنو تاکہ دیکھنے والے سبق لے سکیں۔"

منصور کاغذ بکھیر کر اور خط ڈھونڈنے لگا۔ ایک کاغذ نکال کر وہ مسکرایا۔ ہماری طرف دیکھ کر پیار سے بولا " یہ خط ایک لڑکی کا ہے۔"

" لڑکی کا خط۔" ناصر بھائی نے چونک کر کہا۔ منصور نے نفرت سے ناصر بھائی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں سنو، لکھتی ہیں"

جناب منصور صاحب۔ آداب و تسلیمات !

میں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے شملہ آئی ہوں۔ ایک دن سنجیلی کے راستے میں آپ کو ایک درخت سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ کیا آپ درختوں کی زبان جانتے ہیں؟ امید ہے کہ آپ جواب ضرور دیں گے۔ ایک دن آپ جاکھو میں ایک بندر سے کانا پھوسی میں بات کر رہے تھے۔ جہاں تک میرا خیال ہے آپ انسانوں سے نفرت کرتے ہیں۔ کیا میں اس کا سبب معلوم کر سکتی ہوں۔

مجھ سے آپ کا کوئی تعارف نہیں ہے مگر آپ کی شخصیت نے مجھ پر بہت اثر ڈالا ہے۔ شملے میں میرے چند ایک عزیز اور دوست موجود ہیں مگر اس کے باوجود میں اس خوب صورت ماحول میں بوریت محسوس کرتی ہوں کیونکہ میرے اردگرد جتنے لوگ ہیں وہ سیاست، فلم اور فیشن کے سوا کوئی اور بات نہیں کر سکتے۔ اگر میں آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤں تو آپ جھٹک تو نہ دیں گے۔"

فقط

مقصودہ کلثوم (چھوٹا شملہ)

منصور خاموش ہو گیا۔ ناصر بھائی نے بیتابی سے پوچھا۔ تم نے اس کا کیا جواب دیا منصور؟!

"بتاتا ہوں" منصور نے کاغذ ڈھونڈتے ہوئے کہا۔ "سنو"

پیاری کلثوم

"پیاری" لفظ سے میں نے تم کو اس لئے مخاطب کیا ہے کہ تم نے واقعی میری ہمدردی جیت لی ہے۔ مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تمہاری نگاہوں نے غلط آدمی چنا ہے۔ تم شملے میں چھٹیاں گزارنے آئی ہو یا زندگی! مجھے بھلا اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ تم نے غلط آدمی کو صحیح باتیں بتا کر واقعی بڑی معصومانہ غلطی کی ہے۔ باقی رہا درخت اور بندر سے باتیں کرنے کا معاملہ؟ سو تمہیں ایسی جینیسوں والی حرکتوں پر توجہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم لڑکی ہو اور تمہیں لڑکی ہی رہنا چاہئے۔ اس میں تمہاری اور تمہارے ملک کی بھلائی ہے۔

تمہیں یہ باتیں بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں درخت سے باتیں نہیں کر رہا تھا بلکہ درخت مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ یہی واقعہ تم بندر کی جگہ بھی دہرا لو۔

تمہارے ارد گرد کے لوگ جیسی باتیں کرتے ہیں ٹھیک ہے۔ تم سے کم وہ جینیس بننے کی بیکار کوشش تو نہیں کر رہے ہیں۔ اس لئے یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی۔ باقی رہا سوال دوستی کے ہاتھ بڑھانے کا تو اس سلسلے میں گذارش ہے کہ تم تو میری طرف ہاتھ بڑھا دوگی۔ میں کس طرف ہاتھ بڑھاؤں گا۔

فقط

"منصور"

ایک اور خط سن لو۔ یہ میری پڑوسن کا ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

"مسٹر۔ سلام و نیاز!

میں آپ کی پڑوسن ہوں اور مجھے آپ کے کتے سے سخت شکایت ہے کہ وہ مجھے دیکھ کر بھونکتا ہے۔ کیا آپ سمجھا نہیں سکتے

امید ہے کہ آپ اس کا جلد کوئی بندوبست کریں گے۔

فقط

مسز حیدر"

اور میں نے جواب میں فقط یہ لکھا تھا۔

"محترمہ! میں آپ کا پڑوسی ہوں اور مجھے آپ سے سخت شکایت ہے میرا آپ کو دیکھ کر صرف اس لئے بھونکتا ہے کہ وہ سوچتے ہوئے آدمیوں کے خیالات سُن سکتا ہے۔ اُمید کہ آپ موجودہ روش پر چلنا چھوڑ دیں گی۔

فقط

منصور"

ایک اور خط سنو،

"کافی ہاؤس۔ مال روڈ۔ شملہ

کافی ہاؤس کے بیروں کو شکایت ہے کہ آپ اکثر بل ادا کرنا بھول جاتے اور پھر بعض اوقات آپ زیادہ پیسے دے جاتے ہیں۔

کیا آپ کسی پریشانی میں مبتلا ہیں؟

میں نے کبھی آپ کو مُسکراتے ہوئے نہیں دیکھا، اس کی وجہ بھی غالباً پریشانی ہی ہے۔ میں آپ کی بے نیازی اور خاموشی سے بہت مرعوب ہوا ہوں۔ کیا میں آپ سے تعلقات پیدا کر سکتا ہوں۔

فقط

ڈیوڈ میسی"

میرا جواب بھی سُن لو۔

"مسٹر ڈیوڈ!

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنہیں میں شکایت کا موقعہ دیتا ہوں۔ باقی رہا سوال بل کی ادائیگی کا، تو اگر میں بھول جاتا ہوں تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ بل لینا آپ کے بیروں کا فرض ہے۔

میں نہیں غالباً آپ کے بیرے کسی پریشانی میں مبتلا ہیں۔

آپ نے مجھے کبھی مُسکراتے نہیں دیکھا۔ یہ پڑھ کر میرا خیال ہے کہ میں مسکرایا تھا، مگر میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ میری رائٹنگ ٹیبل کے آگے کوئی آئینہ نہیں ہے۔

آپ میری خاموشی اور بے نیازی سے متاثر ہو کر مجھے مرعوب نہیں کر سکتے۔ تعلقات

پیدا کرنے کا خیال آپ کے ذہن میں کیسے آیا - حیرت کی بات ہے -

فقط
منصورہ"

اب یہ آخری خط سن لو! یہ صحیح معنوں میں خط ہے مگر افسوس، منصور نے آہ بھر کر خط پڑھنا شروع کیا۔

"ہلو جینیس !

میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں، تم بھی جانتے ہو گے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں نے تمہیں پچھلے ماہ گیارہ بار پبلک پلیس میں گھومتے دیکھا ہے اور یہ بات یقیناً قابلِ شرم ہے۔

سنجیلی کے قریب چیڑ کا بوڑھا درخت تمہارے انتظار میں ہے۔ وھائٹ فلاور کا رسٹ ہاؤس تمہاری راہ پہ آنکھیں لگائے ہوئے ہے۔ جاکھو کے بندر تمہارے انتظار میں بیٹھے ہیں اور میں نے سنا ہے تمہیں لوگوں کے خطوط موصول ہو رہے ہیں اور تم ان کے جواب دے رہے ہو۔ کیا تمہارے پاس ان سستی حرکتوں کی کوئی وجہ موجود ہے؟

مجھے جواب دینے کی کوئی خاص ضرورت نہیں، خود کو جواب دے لینا۔ مجھے اطمینان ہو جائے گا۔"

"اس خط پر کسی کا نام نہیں تھا۔" منصور نے فائل سمیٹتے ہوئے کہا۔

"کوئی ایڈریس وغیرہ! یہ خط کہاں سے آیا تھا؟" میں نے حیرانی ظاہر کی۔

"یہ خط لوکل تھا اور شملے سے کسی نے لکھا تھا۔ تحریر اور انداز کافی جانا پہچانا تھا خط سے جینیس کی بو آتی تھی۔"

"جینیس! کون تھا پھر؟" ناصر بھائی نے تقریباً چیخ کر پوچھا۔

"کل تک میں نہ معلوم کر سکا تھا پر آج محسوس ہو رہا ہے کہ یہ خط غالباً میں نے ہی لکھا تھا۔" منصور نے چشمہ صاف کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"گویا خود تم نے۔" میں خاموش ہو گیا۔

"انسان اپنا بہترین رہنما، شفیق دوست اور اعلیٰ ترین ساتھی ہے۔ لوگ خواہ مخواہ دخل در معقولات کرتے ہیں۔ یہ چھیڑ چھاڑ اور انتشار کے قائل ہیں، سکون، گہرائی اور عقل کے دشمن ہیں۔ تمہارا کوئی دوست نہیں... تم خود۔" منصور رک کر بھی گھورنے لگا، پھر مسکرا کر بولا۔ "خیر ہٹاؤ! دوست کا ہونا اور ملنا ناگزیر ہے۔" اور منصور کرسی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

روسی کہانی

ٹالسٹائی

محمد حسن زبیری

ناکردہ گناہ

ولادی میر کے قصبے میں ایک نوجوان تاجر رہا کرتا تھا جس کا نام ایون ایکسینائو تھا۔ اس کی اپنی دو دکانیں اور رہنے کے لئے ایک ذاتی مکان تھا۔

ایون ایک خوش رو نوجوان تھا، اس کے بال خوب صورت اور گھونگھروالے تھے، وہ بے حد بذلہ سنج اور گانے کا شوقین تھا، بہت کم عمری میں اُسے شراب پینے کی عادت پڑ گئی تھی اور اکثر زیادہ پی لینے کے بعد وہ دوسرے لوگوں سے جھگڑ پڑتا تھا، لیکن شادی ہو جانے کے بعد اس نے یہ عادت ترک کر دی اور اب صرف گاہے گاہے مُنہ کا مزا بدلنے کے لئے پی لیا کرتا تھا۔

ایک سال موسم گرما میں ایون ترنی کے میلے میں جا رہا تھا۔ جب وہ اپنے بیوی بچوں سے رخصت ہو رہا تھا اس کی بیوی نے اس سے کہا۔ "ایون آج نہ جاؤ، میں نے آج رات تمہارے متعلق ایک بُرا خواب دیکھا ہے۔"

"تم ڈرتی ہو کہ میلے میں جا کر میں تفریح میں پڑ جاؤں گا۔" ایون نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جانتی کہ میں کیوں ڈر رہی ہوں؟" اُس کی بیوی نے جواب دیا لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ میں نے ایک بُرا خواب دیکھا ہے، میں نے دیکھا کہ تم میلے سے واپس آئے ہو اور جب تم نے اپنی ٹوپی اُتار دی ہے تو تمہارے سر کے بال سفید ہیں۔"

"یہ ایک اچھی علامت ہے۔" ایوآن نے ہنستے ہوئے کہا "تم دیکھنا کہ میں اپنا تمام سامان فروخت کر دوں گا اور تمہارے لئے میلے سے تحفے لے کر آؤں گا۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنی بیوی کو خدا حافظ کہا اور روانہ ہو گیا۔

سفر کا آدھا راستہ طے کرنے کے بعد ایوآن کی ملاقات ایک اور تاجر سے ہوئی جس سے وہ واقف تھا اور وہ دونوں رات گزارنے کے لئے ایک ہی سرائے میں گئے، ان دونوں نے ساتھ بیٹھ کر چائے پی اور اس کے بعد ملحقہ کمروں میں سونے کے لئے چلے گئے۔

ایون زیادہ دیر تک سونے کا عادی نہیں تھا اور دھوپ تیز ہونے سے پہلے سفر طے کر لینے کے خیال سے اس نے سورج نکلنے سے پہلے اپنے گاڑی بان کو جگا کر گاڑی تیار کرنے کے لئے کہہ دیا اس کے بعد وہ سرائے کے مالک کے پاس گیا جو سرائے کے پیچھے ایک جھونپڑی میں رہتا تھا اور اس کا حساب چکانے کے بعد سفر پر روانہ ہو گیا۔

پچیس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ گھوڑوں کو دانہ دینے کے لئے ٹھہر گیا۔ کچھ دیر تک سرائے کے برآمدے میں آرام کرنے کے بعد وہ سرائے کے اندر گیا اور چائے تیار کرنے کا حکم دے کر اپنا سامان نکال کر سجانے لگا۔

کچھ ہی دیر بعد ایک گاڑی سرائے کے دروازے پر آ کر رکی اور اس میں سے ایک افسر مع دو سپاہیوں کے اترا، اس نے ایوآن کے پاس آ کر اس سے سوالات کرنے شروع کر دیئے اور اس سے دریافت کیا کہ وہ کون تھا اور کہاں سے آیا تھا۔ اس کے تمام سوالات کا جواب دیتے ہوئے ایوآن نے اس سے پوچھا "کیا آپ میرے ساتھ چائے نہیں پئیں گے؟" لیکن وہ افسر اس سے برابر جرح کرتا رہا اور اس سے پوچھنے لگا "تم نے رات کہاں گزاری تھی؟ کیا تم تنہا تھے یا تمھارے ساتھ کوئی اور دوسرا تاجر بھی تھا؟ کیا صبح کو تمہاری اس دوسرے تاجر سے ملاقات ہوئی تھی؟ تم سورج نکلنے سے پہلے سرائے سے کیوں روانہ ہو گئے تھے؟"

ایوآن کو سخت تعجب تھا کہ اس سے یہ تمام سوالات کیوں کئے جا رہے تھے، اس نے تمام واقعات صحیح طور پر جاننے کے بعد پوچھا "لیکن آپ مجھ سے اس طرح جرح کیوں کر رہے ہیں، جیسے میں کوئی چور یا ڈاکو ہوں؟ میں تجارت کے سلسلے میں سفر کر رہا ہوں، اور آپ کو مجھ سے اس قسم کے سوالات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"

اس افسر نے سپاہیوں کو آواز دی اور پھر کہنے لگا۔ "میں اس ضلع کا پولیس افسر

اور تم سے یہ سوالات اس لئے کر رہا ہوں کہ وہ تاجر جس کے ساتھ تم نے رات گزاری تھی صبح کو مردہ پایا گیا ہے' اس کا گلا کٹا ہوا تھا' ہم تمہارے سامان کی تلاشی لیں گے۔"

وہ لوگ سرائے کے اندر داخل ہوئے' پولیس افسر اور سپاہیوں نے ایون کا سامان کھول کر تلاشی لی' یکایک اس افسر کو ایک بیگ کے اندر ایک چاقو نظر پڑا جسے دیکھتے ہی اس نے چلا کر پوچھا "یہ چاقو کس کا ہے؟"

ایون نے اس طرف دیکھا اور اپنے بیگ میں سے ایک خون آلود چاقو نکلتے ہوئے دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔

"اس چاقو پر خون کہاں سے آیا؟" افسر نے پوچھا۔

ایون نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا اور وہ ہکلاتے ہوئے صرف اتنا ہی کہہ سکا "مجھے نہیں معلوم' میرا نہیں ہے۔"

اس پر پولیس افسر نے کہا "آج صبح اس تاجر کو اس کے بستر پر مردہ پایا گیا' اس کا گلا کٹا ہوا تھا' صرف تم ہی ایک ایسے شخص ہو جو یہ کام کر سکتے تھے' سرائے کے دروازے اندر سے بند تھے اور تم دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا شخص وہاں موجود نہیں تھا' اب یہ خون آلود چاقو تمہارے بیگ میں سے برآمد ہوا ہے اور تمہارا چہرہ اور حرکات بھی تمہارے جرم کی مخبری کر رہی ہیں۔ بتاؤ تم نے کس طرح مارا اور کتنا روپیہ چوری کیا؟"

ایون نے قسم کھائی کہ اس نے یہ کام نہیں کیا تھا' چائے پینے کے بعد اس نے اس تاجر کی شکل تک نہیں دیکھی تھی' اس کے پاس اس کے اپنے ۸ ہزار روبل کے علاوہ اور روپیہ نہیں تھا' لیکن اس کی آواز بھرآئی ہوئی اور چہرہ زرد تھا اور وہ خوف سے اس طرح کانپ رہا تھا جیسے وہ خود ہی مجرم ہو۔

پولیس افسر نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ ایون کو باندھ کر گاڑی میں ڈال دیں۔ جب سپاہیوں نے اس کی ٹانگیں باندھ کر گاڑی میں ڈالا تو ایون نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور رونے لگا۔ اس کا تمام سامان اور روپیہ اس سے لے لیا گیا اور ولادی میر کے قریب کے شہر میں لے جا کر قید کر دیا گیا۔ اس دوران میں اس کے چال چلن کے بارے میں تحقیقات کی گئی تو شہر کے تاجروں اور دوسرے باشندوں نے بتایا کہ وہ پچھلے زمانے میں شراب پیا کرتا تھا اور آوارگی بھی کرتا تھا لیکن اب وہ ایک اچھا آدمی تھا۔ مقدمہ

شروع ہوا۔ ایوان پر زار زن کے ایک تاجر کو قتل کرنے اور اس کے بیس ہزار روبل چرانے کے الزامات لگائے گئے۔

ایوان کی بیوی بہت زیادہ پریشان تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس بات پر یقین کرے، اس کے سب بچے بہت چھوٹے تھے اور ان میں سے ایک ابھی دودھ پیتا تھا۔ اپنے بچوں کو ساتھ لے کر وہ اس شہر میں گئی جہاں اس کا شوہر قید تھا۔ اوّل تو اسے اس سے ملنے کی اجازت نہیں ملی لیکن بہت زیادہ عاجزی اور خوشامد کرنے پر اسے اجازت مل گئی اور اسے اس کے پاس لے جایا گیا۔ جب اس نے اپنے شوہر کو چوروں اور مجرموں کے ساتھ قیدیوں کے لباس اور زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھا تو وہ غش کھا کر گر گئی اور اُسے کافی دیر تک ہوش نہیں آیا۔ ہوش آنے پر وہ اپنے بچوں کو ساتھ لے کر اس کے پاس بیٹھ گئی، اسے گھر کے حالات بتانے کے بعد اس نے ایوان سے تمام واقعات دریافت کیے جو اس نے بتا دیے۔ اس کے بعد اس کی بیوی نے اس سے پوچھا "اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"ہمیں زار کو رحم کی درخواست دینی چاہیے تاکہ وہ ایک بے گناہ شخص کو برباد ہونے سے بچالے" ایوان نے کہا۔

اس پر اس کی بیوی نے اُسے بتایا کہ "اس نے زار کو رحم کی درخواست بھیجی تھی لیکن وہ نامنظور کر دی گئی"، ایوان نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کا چہرہ اور زیادہ اُتر گیا۔

"میں نے وہ خواب یوں ہی نہیں دیکھا تھا کہ تمہارے سر کے بال سفید ہو گئے ہیں" اس کی بیوی نے کہا "تمہیں یاد ہے؟ تمہیں اس روز روانہ نہیں ہونا چاہیے تھا" اس نے اپنی انگلیاں اس کے بالوں میں پھیرتے ہوئے کہا "ایوان پیارے، کیا تم اپنی بیوی کو صحیح بات نہیں بتاؤ گے؟ کیا واقعی تم نے اس تاجر کو قتل نہیں کیا تھا؟"

"اچھا تو تم بھی مجھ پر شک کرتی ہو!" ایوان نے کہا اور پھر وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگا۔

اسی وقت ایک سپاہی نے آکر کہا کہ اس کی بیوی اور بچوں کو چلا جانا چاہیے کیونکہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا اس لیے ایوان نے اپنے بیوی بچوں کو آخری بار الوداع کہا۔

ان کے چلے جانے کے بعد ایوان نے وہ تمام گفتگو اپنے ذہن میں دہرائی جو اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان ہوئی تھی اور جب اُسے یاد آیا کہ اس کی بیوی نے بھی اس پر

شک کیا تھا تو اُس نے اپنے آپ سے کہا" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف خدا ہی کو صحیح حالات کا علم ہے، اس لئے ہمیں صرف اسی سے رحم کی درخواست کرنی چاہئے اور اسی سے رحم کی امید رکھنی چاہئے۔"
اس کے بعد ایوان نے اور کوئی درخواست نہیں لکھی، اس کی تمام کوششیں منقطع ہو چکی تھیں اس لئے وہ صرف خدا ہی سے دعا مانگا کرتا تھا۔

ایوان کو کوڑے لگنے اور کانوں میں کام کرنے کے لئے بھیجے جانے کی سزا دی گئی۔ سزا کے بموجب اس کو کوڑے لگائے گئے اور کوڑے لگنے سے جو زخم آئے تھے اُن کے مندمل ہونے پر اسے دوسرے سزا یافتہ مجرموں کے ساتھ سائبیریا بھیج دیا گیا۔

ایوان پورے چھبیس سال ایک سزا یافتہ مجرم کی حیثیت سے سائبیریا میں رہا، اس کے سر کے تمام بال برف کے مانند سفید ہو گئے اور اس کی داڑھی بھی لمبی اور سفید ہو گئی، اس کی تمام خوش طبعی ختم ہو گئی اور کمر جھک گئی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا تھا اور بہت کم بولتا تھا اور اس کی مسکراہٹ بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی تھی لیکن وہ اکثر عبادت ضرور کیا کرتا تھا۔

جیل خانے میں ایوان نے جوتے بنانے سیکھے تھے اور اس ذریعے سے کچھ روپیہ حاصل کرکے اس نے ایک کتاب "درویشوں کی کہانیاں" خرید لی تھی۔ جب کبھی جیل خانے میں پڑھنے کے لائق روشنی ہوتی تھی تو وہ یہ کتاب پڑھا کرتا تھا۔ ہر اتوار کو وہ جیل خانے کے گرجا میں بائیبل پڑھتا تھا اور مقدس گیت گایا کرتا تھا کیونکہ اس کی آواز ابھی تک دل کش تھی۔

جیل کے افسران ایوان کو اس کی خاموش طبعی کی وجہ سے پسند کرتے تھے اور اس کے ساتھی قیدی بھی اس کی عزت کرتے تھے، وہ لوگ اسے "دادا" اور "درویش" کہا کرتے تھے۔ انھیں جب کبھی کسی کے بارے میں جیل خانے کے افسران کو کوئی درخواست دینی ہوتی تھی تو وہ ہمیشہ ایوان ہی کو اپنا نمائندہ مقرر کرتے تھے اور جب کبھی قیدیوں میں آپس میں کوئی جھگڑا ہو جاتا تھا تو وہ اسی کے پاس تصفیہ کرانے کے لئے آتے تھے۔

جیل خانے میں آنے کے بعد ایوان کو اپنے گھر والوں کی کوئی خبر نہیں مل سکی تھی اور وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی بیوی یا بچے زندہ بھی تھے یا مر چکے تھے۔

ایک روز کچھ نئے قیدی جیل خانے میں لائے گئے۔ شام کو پرانے قیدی ان نئے قیدیوں کے گرد جمع ہوئے اور ان سے پوچھنے لگے کہ وہ کس جگہ کے رہنے والے تھے اور انھیں کس جرم میں سزا دی گئی تھی۔ دوسروں کی طرح ایوان بھی ان نئے قیدیوں کے

پاس بیٹھ گیا اور بے دلی کے ساتھ ان کی گفتگو سننے لگا۔

ان قیدیوں میں سے ایک قیدی جو ساٹھ سال کا تنومند اور قدآور انسان تھا اور جس کی سفید داڑھی باریک ترشی ہوئی تھی دوسروں کو بتا رہا تھا کہ اسے کس جرم کی پاداش میں سزا ملی تھی۔

"تو دوستو!" اس نے کہا "میں نے صرف ایک گاڑی میں جتا ہوا گھوڑا کھول لیا تھا اور اسی پر مجھے گرفتار کر کے چوری کا الزام دیا گیا۔ میں نے کہا کہ میں نے وہ گھوڑا صرف اس لئے کھولا تھا کہ جلد اپنے گھر پہنچ سکوں اور اس کے بعد میں نے اسے چھوڑ بھی دیا تھا' اس کے علاوہ اس گاڑی کا کوچوان میرا دوست تھا لہذا میرے خیال میں یہ کوئی جرم نہیں تھا اس پر بھی انھوں نے یہی کہا کہ میں چور تھا حالانکہ وہ یہ تک نہیں جانتے تھے کہ میں نے اسے کہاں اور کس طرح چرایا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے واقعی ایک جرم کیا تھا اور دراصل مجھے اب سے بہت عرصے پیشتر یہاں آجانا چاہئے تھا لیکن اس مرتبہ میں پکڑا نہیں جاسکا تھا' اس مرتبہ مجھے بیکار یہاں بھیج دیا گیا ہے۔ ارے ہاں۔ مگر میں یہ سب کچھ جھوٹ کہہ رہا ہوں' میں اس سے قبل بھی سائبیریا آچکا ہوں لیکن زیادہ عرصے تک یہاں نہیں ٹھہرا تھا۔"

"تم کہاں کے رہنے والے ہو؟" کسی نے پوچھا۔

"ولادی میر کا۔ میرے خاندان کے سب لوگ وہاں کے رہنے والے ہیں۔ میرا نام ماکر ہے اور لوگ مجھے سمونچ بھی کہتے ہیں۔"

ایون نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور پوچھا "سمونچ! یہ تو بتاؤ تمھیں ولادی میر کے تاجر ایون اکسیناؤ کے گھر والوں کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟ کیا وہ لوگ زندہ ہیں؟"

"میں ان لوگوں سے واقف ہوں۔ ایون کے لڑکے کافی مالدار ہیں' ان کا باپ سائبیریا میں ہے' وہ بھی ہماری طرح ایک مجرم ہے۔ مگر دادا یہ تو بتاؤ کہ تم یہاں کیسے آئے۔"

ایون اپنی بدقسمتی کا دکھڑا رونا نہیں چاہتا تھا اس نے ایک آہ سرد بھر کر کہا۔

"میں اپنے گناہوں کی پاداش میں چھبیس سال سے یہاں ہوں۔"

"کون سے گناہ؟"

"ہاں لیکن میں اسی کا مستحق ہوں گا۔" ایون نے صرف اسی قدر کہا' وہ کچھ اور نہ کہتا لیکن اس کے ساتھیوں نے نو وارد قیدیوں کو بتایا کہ ایون کو سائبیریا کیوں بھیجا گیا تھا

کس طرح کسی شخص نے ایک تاجر کو قتل کر کے اپنا چاقو ایون کے سامان میں چھپا دیا تھ
اور اس طرح ایون کو غیر منصفانہ طریقے پر سزا دی گئی تھی۔"

یہ سن کر ماکر نے ایون کی طرف دیکھا اور اپنے گھٹنے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہنے لگا "واہ بھئی بہت خوب۔ بہت خوب! مگر دادا تم تو بہت زیادہ بوڑھے ہو گئے ہو!"

دوسروں نے اس سے پوچھا کہ وہ اس قدر متعجب کیوں تھا اور اس سے قبل اس نے ایون کو کہاں دیکھا تھا، لیکن ماکر نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، اس نے صرف اتنا کہا "دوستو! یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ہم لوگ ایک دوسرے سے یہاں مل رہے ہیں۔"

یہ الفاظ سن کر ایون نے سوچا ممکن ہے یہ شخص جانتا ہو کہ اس تاجر کو کس نے قتل کیا تھا لہذا وہ کہنے لگا "سمونچ، شاید تمہیں بھی اس واقعے کا علم ہو اور ممکن ہے تم نے اس سے پیشتر بھی مجھے دیکھا ہو۔"

"مجھے کیسے علم نہ ہوتا۔" اس نے کہا۔ "ایسی خبریں چھپی نہیں رہتیں۔ لیکن اسے بہت زمانہ گزر گیا اور جو کچھ میں نے سنا تھا مجھے یاد نہیں رہا۔"

"شاید تم نے یہ بھی سنا ہو کہ اس تاجر کو کس نے قتل کیا تھا؟" ایون نے پوچھا۔

"اسی نے قتل کیا ہو گا جس کے بیگ سے چاقو برآمد ہوا تھا۔" سمونچ نے ہنس کر کہا "اور اگر بالفرض کسی دوسرے شخص نے وہ چاقو اس کے بیگ میں رکھ دیا تھا پھر بھی وہ جب تک پکڑا نہ جائے چور نہیں ہو سکتا اور پھر کوئی تمہارے بیگ میں چاقو کس طرح رکھ سکتا تھا جب کہ وہ تمہارے سر کے نیچے رکھا ہوا تھا، ایسا کرنے سے یقیناً تمہاری آنکھ کھل جاتی۔"

یہ الفاظ سن کر ایون کو یقین ہو گیا کہ ضرور یہی وہ شخص تھا جس نے اس تاجر کو قتل کیا تھا، وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ اس رات وہ بالکل نہیں سو سکا، وہ بہت زیادہ بے چین تھا اور طرح طرح کے خیالات اس کے دل میں آ رہے تھے، اس کی نظروں کے سامنے اس کی بیوی کی اس وقت کی صورت پھر رہی تھی جب وہ میلے جانے کے لئے اس سے رخصت ہو رہا تھا، وہ اس کی صورت اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ اس کے سامنے موجود ہو۔ وہ اپنی آنکھوں سے اس کا چہرہ اور آنکھیں دیکھ سکتا تھا، اس کے کان اسے بولتے اور ہنستے ہوئے سن سکتے تھے۔ پھر اس نے اپنے بچوں کو دیکھا، چھوٹے چھوٹے معصوم

بچے، جیسے کہ وہ اس وقت تھے۔ ان میں سے ایک بچہ ایک چھوٹا سا لبادہ پہنے ہوئے تھا اور دوسرا اپنی ماں کا دودھ پی رہا تھا۔ پھر اس نے تصور کی نگاہوں سے اپنے آپ کو دیکھا جیسا کہ وہ پہلے تھا، جوان اور بے فکرا! اسے یاد آیا کہ جس وقت اسے گرفتار کیا گیا وہ کس طرح سرائے کے برآمدے میں بیٹھا ہوا ستار بجا رہا تھا اور اس وقت وہ کس قدر مطمئن اور خوش تھا، اس کی نظروں میں وہ جگہ پھر گئی جہاں اس کے کوڑے لگائے گئے تھے۔ جلاد اور ارد گرد کھڑے لوگوں کی شکلیں بھی اس کی نگاہوں کے سامنے تھیں۔ پاؤں میں پڑی ہوئی زنجیریں، دوسرے ملزموں کے چہرے، جیل خانے کی زندگی کے گزشتہ چھبیس سال اور اپنا قبل از وقت بڑھاپا۔ یہ سب کچھ وہ اپنی تصور کی آنکھوں سے دیکھتا رہا، ان تمام خیالات نے اس کے دماغ کو اس قدر پراگندہ کر دیا کہ وہ خودکشی کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

اور یہ سب کچھ اس بدمعاش کا کیا دھرا ہے! ایون نے سوچا اور یہ سوچ کر اسے مارکر پر اتنا غصہ آیا کہ اس نے اس سے انتقام لینے کی ٹھان لی خواہ ایسا کرنے میں وہ خود ہی ختم ہو جائے۔ تمام رات وہ دعائیں مانگتا رہا لیکن اس کی روح کو سکون نہیں مل سکا۔ اگلے روز وہ دن بھر مارکر کے نزدیک نہیں گیا اور نہ اس کی طرف دیکھا۔

دو ہفتے اسی طرح گزر گئے، ایون کی راتوں کی نیند اڑ گئی تھی اور وہ اس قدر پریشان ہو گیا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔

ایک رات جب وہ جیل خانے کے اندر ٹہل رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ کچھ مٹی ایک ایسی الماری میں سے گر رہی جس پر قیدی سویا کرتے تھے، وہ یہ دیکھنے کے لئے رکا کہ وہ کیا چیز تھی، اسی وقت مارکر گھسٹتا ہوا الماری کے نیچے سے نکلا اور خون زدہ آنکھوں سے ایون کی طرف دیکھنے لگا۔ ایون نے اس کی طرف دیکھے بغیر چلا جانا چاہا لیکن مارکر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے بتانے لگا کہ اس نے دیوار کے نیچے ایک سوراخ کر لیا تھا جس کی مٹی وہ جوتوں میں بھر لیتا تھا اور جب صبح کو قیدی کام پر جاتے تھے تو وہ اس مٹی کو راستے میں پھینک دیا کرتا تھا،

"بڑے میاں تم خاموش رہے تو میں تمہیں بھی باہر نکال لے چلوں گا اور اگر تم نے زبان کھولی تو وہ لوگ کوڑے مار مار کر میری جان لے لیں گے، مگر میں اس سے پیشتر ہی تمہیں مار ڈالوں گا۔"

اپنے دشمن کو دیکھ کر ایون غصے سے کانپنے لگا اور اس نے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے

کہا "مجھے یہاں سے بھاگنے کی کوئی خواہش نہیں ہے، تمہیں بھی میری جان لینے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ بہت عرصہ ہوا تم مجھے مار چکے ہو۔ رہا اس بھید کے کھولنے کا سوال تو میں وہی کروں گا جیسی مجھے خدا کی طرف سے ہدایت ہوگی۔"

اگلے روز جب قیدیوں کو باہر کام پر لے جایا جا رہا تھا تو نگرانی کرنے والے سپاہیوں نے دو ایک قیدیوں کو اپنے جوتوں میں سے کچھ مٹی نکال کر پھینکتے ہوئے دیکھ لیا۔ جیل خانے کی تلاشی لی گئی اور سرنگ کا پتہ چل گیا۔ جیل خانے کے گورنر نے آکر قیدیوں سے سوالات کئے تاکہ معلوم کیا جا سکتا کہ سرنگ کس نے کھودی ہے۔ ان سب نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا، جنہیں معلوم تھا وہ بھی ماکر کا نام بتانا نہیں چاہتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اسے کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیا جائے گا۔ آخر کار گورنر الیوان سے مخاطب ہوا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ ایک حق پرست انسان ہے۔

"تم ایک راست گو انسان ہو۔" گورنر نے اس سے کہا۔ "خدا کو حاضر و ناظر جان کر بتاؤ کہ یہ سرنگ کس نے کھودی تھی؟"

ماکر وہاں اس طرح کھڑا تھا جیسے اس واقعے سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ الیوان کے ہاتھ اور ہونٹ کانپنے لگے اور کچھ دیر تک اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا، اس نے دل میں سوچا "میں اس شخص کو کیوں بچاؤں جس نے میری زندگی برباد کر دی ہے۔ اسے میری تکلیفوں کا خمیازہ بھگتنا چاہئے۔ لیکن اگر میں نے اس کا نام بتا دیا تو وہ اس کی جان لے لیں گے اور ہو سکتا ہے کہ میں اس پر غلط شبہ کر رہا ہوں، اور پھر بھی مجھے اس سے کیا فائدہ پہنچے گا؟"

"اچھا بڑے میاں!" گورنر نے دوبارہ پوچھتے ہوئے کہا۔ "مجھے صحیح بات بتا دو یہ سرنگ کس نے کھودی ہے؟"

الیوان نے ایک نظر ماکر کی طرف دیکھا اور پھر کہنے لگا "حضور میں نہیں بتا سکتا، خدا کی مرضی نہیں ہے کہ میں کچھ بتاؤں، آپ میرا جو چاہے کر سکتے ہیں، میں مجبور ہوں۔"

گورنر نے لاکھ کوشش کی مگر الیوان نے کچھ اور نہیں کہا لہٰذا معاملے کو وہیں ختم کر دیا گیا۔

اس رات جب کہ الیوان بستر پر لیٹا ہوا اونگھ رہا تھا کوئی شخص خاموشی سے آکر اس کے بستر پر لیٹ گیا۔ تاریکی میں نظر جما کر دیکھتے ہوئے اس نے ماکر کو پہچان لیا۔

"اب تم کیا چاہتے ہو؟" ایوَن نے پوچھا۔ "اور یہاں کیوں آئے ہو؟"

ماکر خاموش رہا، ایوَن اُٹھ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ "تم یہاں سے بھاگ جاؤ ورنہ میں پہرے دار کو بلاتا ہوں۔" ماکر، ایوَن کے اوپر جھک گیا اور دبی ہوئی زبان سے کہنے لگا۔

"ایوَن، مجھے معاف کردو!"

"کس لئے؟"

"میں نے ہی اس تاجر کو قتل کیا تھا اور چاقو تمہارے سامان میں چھپا دیا تھا، دراصل میرا ارادہ تمہیں بھی قتل کرنے کا تھا، لیکن باہر کھٹکا سن کر میں نے چاقو تمہارے بیگ میں رکھ دیا اور کھڑکی سے کود کر بھاگ گیا۔"

"ایوَن خاموش تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کہے۔ ماکر بستر سے اٹھ کر زمین پر دوزانو بیٹھ گیا۔

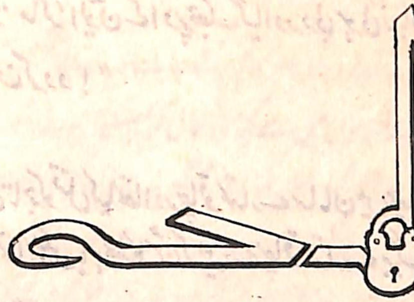
"ایوَن!" اس نے کہا "مجھے معاف کردو، خدا کے لئے معاف کردو، میں اس بات کا اعتراف کرلوں گا کہ اس تاجر کو میں نے قتل کیا تھا، وہ لوگ تمہیں رہا کردیں گے اور پھر تم اپنے گھر جاسکو گے۔"

"تمہارے لئے یہ سب کچھ کہہ دینا بہت آسان ہے۔" ایوَن نے کہا، "مگر میں تمہاری وجہ سے چھبیس سال سے مصیبتیں اٹھا رہا ہوں۔ اب میں کہاں جاؤں گا۔ میری بیوی مر چکی ہے اور میرے بچے مجھے بھول چکے ہیں، اب میرا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔"

ماکر اسی طرح بیٹھا رہا اور اپنا سر زمین پر پٹخنے لگا۔ "ایوَن مجھے معاف کردو!" اس نے روتے ہوئے کہا، "جب میرے کوڑے لگائے گئے تھے اس وقت بھی مجھے اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی جتنی اس وقت تمہیں دیکھ کر ہو رہی ہے۔ اس کے باوجود تم نے مجھ پر ترس کھایا اور بچالیا۔ مسیح کے لئے مجھے معاف کردو!" اور یہ کہہ کر وہ سسکیاں بھر کر رونے لگا۔

اسے سسکیاں بھرتے دیکھ کر ایوَن بھی رونے لگا۔ "تمہیں خدا معاف کرے گا!" اس نے کہا۔ "ہوسکتا ہے کہ میں تم سے بدرجہا بدتر ہوں۔" اور یہ الفاظ ادا کرنے سے اس کا دل ہلکا ہوگیا، گھر کی یاد بھی اس کے دل سے جاتی رہی، اب اسے جیل خانے سے جانے کی مطلق خواہش نہیں رہی بلکہ وہ صرف اپنی آخری گھڑی کا انتظار کرنے لگا۔

ایوَن کے منع کرنے کے باوجود ماکر نے اپنے جرم کا اقبال کرلیا لیکن جب اس کی رہائی کا حکم پہنچا تو ایوَن زندگی کی قید سے آزاد ہوچکا تھا۔



مسعود مفتی

نیلی، بھوری، سبز آنکھیں مجھے ٹکر ٹکر دیکھنے لگیں۔

"ڈارک بوائے!"، گول مٹول معصوم چہرے آپس میں سرگوشی کرنے لگے۔

"آئیے اگلے کمرے میں چلیں۔" منیجر نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ منیجر مڑا تو ایک بچے نے آنکھیں سکوڑ کر میرا منہ چڑایا۔ دوسرے نے زبان باہر نکال کر آنکھ ماری۔ اور میں ہنس کر ہاتھ ہلاتے ہوئے باہر آگیا۔

"یہ عورتوں کا سیکشن ہے۔" ہم ایک بڑے ہال میں داخل ہوئے۔ "جو عورتیں کوئی اور کام نہیں کرتیں وہ یہاں آکر کشیدہ کاری کرتی ہیں، بعض اپنے گھروں کی مختلف چیزوں پر پینٹ کرتی ہیں —— بعض کرسیاں بنتی ہیں —— سارا سامان اسکول مہیا کرتا ہے۔"

دو ایک عورتیں میری طرف دیکھ کر مسکرائیں۔ باقی کام میں مصروف رہیں۔ گو سر جھکے ہونے کے باوجود انھیں علم تھا کہ کون آیا ہے اور کدھر کھڑا ہے۔ چند ایک بوڑھی عورتوں کے ہونٹ بے آواز ہل رہے تھے۔ کیا کرتیں بے چاریاں؟ بولنے کی عادت اور اسکول کے قواعد، دونوں سے مجبور تھیں۔

"دراصل اسکول کا مقصد یہ ہے کہ پنگوڑے سے قبر تک ہر عمر کے فارغ اوقات کا مفید استعمال کیا جائے۔" منیجر عالی شان سیڑھیوں پر مجھے راستہ دکھا رہا تھا۔

"ہر عمر کے لوگ اسکول کے مختلف حصّوں میں اپنی دلچسپی کے مطابق کام کرتے اور وقت گزارتے ہیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جو لڑکے اور لڑکیاں فارغ ہونے کی وجہ سے ٹیڈی بوائز اور گرلز بنتے وہ اب سُدھر گئے ہیں۔ یہ یوتھ سیکشن ہے۔"

بہت بڑے ہال کے چکنے فرش پر کئی لڑکے اور لڑکیاں اوٹ پٹانگ سی موسیقی کے ساتھ رقص کر رہے تھے۔ دو ایک جوڑے اس ابتدائی مرحلے سے گزر کر دیواروں سے لگے بوس و کنار میں مصروف تھے۔ ہمیں آتا دیکھ کر دوسروں نے انھیں ٹھوکے دیئے اور وہ بھی ڈانس میں شریک ہو گئے۔ راک اینڈ رول سے مستائی ہوئی ایک چنچل لڑکی نے مجھے لاوارث اجنبی سمجھا اور دیکھتے ہی دو انگلیاں چوم کر ہاتھ میری طرف لہرایا، لیکن مینیجر پر نظر پڑتے ہی دو جستوں میں دروازے سے باہر بھاگ گئی۔ مجھے جھینپتا دیکھ کر مینیجر میرا دل رکھنے کو بولا۔ "کاش آپ کی جگہ میں ہوتا مسٹر قریشی ... بشرطیکہ اس بچی کی جگہ کوئی بالغ لڑکی ہوتی۔"

"یہ تیرنے کے لئے تالاب ہے۔" چند ایک بچے غڑاپ غڑاپ چھلانگیں مار گئے۔ بلّوری پانی میں ان کے دودھیا جسم ٹیڑھے بینگے اور چپٹے ہونے لگے۔

مینیجر اپنے ساتھ لئے مجھے سوہام کا اسکول دکھاتا رہا اور ساتھ ساتھ چٹکلے کہتا ہوا انگریز قوم کے مخصوص اور لافانی ذوقِ مزاح کا مزہ چکھاتا رہا۔ قصبے کا یہ اسکول محض کہنے کو اسکول تھا ورنہ در اصل تو ہر عمر کے لوگوں کے لئے نہایت عمدہ کلب تھا جس کی چھوٹی سی دنیا شام کے قریب آباد ہوتی تھی۔ انگلستان بھر میں ایسے کلب صرف درجن بھر ہیں اور بہت مفید کام کر رہے ہیں۔ لائبریری کھیلیں، جمنیزیم، کینٹین، ٹیلی ویژن روم، سینما ہال، لاؤنج وغیرہ ہر چیز موجود تھی اور میں اس وسیع عمارت میں اتنی مکمل تفریح گاہ اور اسکول دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ جس میں سوہام کے علاوہ اردگرد کے قصبوں سے بھی لوگ شرکت کرنے کے لئے آتے تھے اور اپنے فارغ اوقات کو انتہائی مفید طریقے سے گزارتے تھے۔

"یہ ہمارا آرٹ سیکشن ہے۔" ایک بہت بڑے ہال میں مختلف حصّے تھے:۔ بُت تراشی، آئل پینٹنگ، سکیچنگ وغیرہ اِدھر اُدھر کینوس، فریم، برش وغیرہ پڑی تھیں۔ کسی کسی جگہ کوئی شوقین مرد عورت کام کر رہے تھے۔

"ہلو جان !" منیجر ایک بوڑھے کے پاس رُک گیا۔ "کس منزل میں ہے تمھاری تصویر؟"
"اُس میں ہے مسٹر وائن۔" وہ ردّی کی ٹوکری کی طرف اشارہ کرکے خفگی سے بولا۔
"ارے پھر پھاڑ ڈالی تم نے۔"
"تو کیا مجھے اپنی چیز پھاڑنے کا بھی حق نہیں؟" وہ لمبے برش کو تارپین کے تیل سے دھوتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ میری موجودگی سے منیجر کچھ کھسیانا سا ہوا لیکن شکست کے لمحات میں جانا نہیں چاہتا تھا۔
"لیکن ہوا کیا تھا؟"
"کچھ نہیں۔ ۔ ۔ مس ٹیلر تو یہی کہے گی کہ کچھ نہیں ہوا۔ ۔ ۔ لیکن میری تصویر کا ستیاناس کرڈالا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر اسے کئی سالوں کا تجربہ ہے تو ضروری ہے کہ وہ سارا میری تصویروں میں ہی گھسیڑا جائے؟ وہ پڑی ہے اب تصویر ادھر۔ ۔ ۔ ۔ جتنی چاہے اس میں تصحیح کرلے۔"
وہ سخت غصہ میں تھا۔ اس کے بوڑھے ہونٹ پھڑک رہے تھے اور بجلی کی روشنی میں رال کی بوندیں ان کے کونوں میں چمک رہی تھیں۔ ویسے بھی وہ کافی غلیظ تھا۔ ایک آنکھ سے پانی رِس رہا تھا، چپٹے نتھنوں میں سے گچھا بھر بال باہر کو جھانک رہے تھے۔ ٹائی گلے میں ویسے ہی لٹکی ہوئی تھی جس کی گرہ خصوصیت سے میلی تھی۔ اسے غصہ میں دیکھ کر منیجر نے موضوع بدل دیا۔
"اچھا ان سے ہلو —— مسٹر قریشی —— ہمارے نئے میڈیکل آفیسر۔"
اُس نے میری طرف دیکھ کر سر ہلایا اور پھر اپنی تصویر کے ٹکڑوں کو دیکھنے لگا۔ چند لمحے بعد ایک دم سے "گڈ نائٹ" کہہ کر چل دیا۔
"یہ بھی عجیب آدمی ہے۔" منیجر ہنس کر کہنے لگا۔ "کہتا ہے تصویر خالص میری ہو۔ اس میں مس ٹیلر بھی تصحیح نہ کرے جو اس سیکشن کی انچارج ہے اور کام سکھاتی ہے۔ آج اس نے کوئی درستی کی ہوگی تو اس نے تصویر پھاڑ ڈالی۔"
"یہ کیوں؟ بہت اچھا آرٹسٹ ہے کیا؟"
"اچھا آرٹسٹ؟" منیجر ہنسنے لگا۔ "برش تک پکڑنا تو آتا نہ تھا۔ جب یہ ہمارے پاس آیا۔ اس کی ہسٹری بھی خوب دلچسپ ہے۔ قریباً دو سال پہلے یہ ہماری کلب کا ممبر

بنا۔ پہلے ہی دن سے اس سیکشن میں آنے لگا۔ اسکول کے باقی شعبوں سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ یہیں آتا ہے، سب سے پہلے آتا ہے اور سب سے آخر میں جاتا ہے۔ سخت محنتی آدمی ہے۔ تعجب ہے ساٹھ برس کی عمر میں اتنا کام کیسے کر لیتا ہے۔ جان توڑ کر کام سیکھا ہے اس نے۔ اور جب سے آیا ہے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اب بڑی عمدہ تصویریں بنا لیتا ہے۔ معلوم نہیں اس عمر میں اسے کیا جوش آیا ہے؟ اور پھر مزہ یہ کہ پچھلے چند دنوں سے اصرار کرتا ہے کہ اپنی تصویریں آپ ہی بنائے گا اور کسی کو اس میں تصحیح نہ کرنے دے گا۔ . . . . . سگرٹ پئیں گے آپ؟"

"شکریہ"۔ اور ہم آگے چل دیئے۔

اگلے روز سے میں نے کام پر جانا شروع کر دیا۔ کام کچھ زیادہ نہ تھا۔ پارٹ ٹائم ملازمت تھی۔ میں لندن سے ایم۔ آر۔ سی۔ پی کرنے کے بعد ایک آدھ ڈپلوما اور کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ فائدہ تھا کہ کچھ رقم مل جانے سے مفت میں پڑھ جاؤں گا اور اپنے دیس میں میرے والدین کو یہ فائدہ پہنچے گا کہ وہ اپنے ملنے والوں میں چند ماہ اور ڈینگیں مار سکیں گے کہ اپنے بچے کو انگلینڈ میں بڑی مشکل سے پڑھا رہے ہیں۔ یہاں ہفتے میں دو چار روز صرف دو دو گھنٹے کے لئے آنا ہوتا تھا اور مریضوں کی معمولی تکالیف کے لئے دوائی تجویز کر دیتا تھا۔ گو اسکول کے ممبر کوئی اڑھائی سو کے قریب تھے لیکن زیادہ تر نیشنل ہیلتھ اسکیم میں اپنے ڈاکٹروں سے دوائی لیتے تھے۔ مجھے تو اسکول نے محض سہولت کے لئے میڈیکل آفیسر رکھا ہوا تھا۔ تھوڑے کام کے لئے کافی رقم مل جاتی تھی اور ساتھ ہی ان لوگوں کی زندگی دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا جس کا مجھے خصوصی طور پر بہت شوق تھا۔ اس لئے تھوڑی دیر اپنے کمرے میں مریض دیکھنے کے بعد میں اِدھر اُدھر مختلف شعبوں میں چکر لگاتا رہتا۔ کچھ دنوں بعد سبھی لوگ میرے دوست بن گئے تھے۔

ایک روز جان میرے پاس آیا۔ گزشتہ تین روز سے سخت برف باری ہو رہی تھی اور اس کے ہاتھوں کی انگلیاں سردی سے سوج گئی تھیں۔ وہ بڑی بے صبری سے دروازہ میں داخل ہوا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھیلا کر میز پر رکھ دیں اور بڑے روکھے انداز میں پوچھنے لگا۔

"ڈاکٹر! میری ان انگلیوں کو جلد از جلد کب تک ٹھیک کر سکتے ہو؟"

"ایک ہفتے میں۔" اس کے پوچھنے کے انداز سے چڑ کر میں نے سرد مہری سے جواب دیا۔

"نالائق ہو تم سب ڈاکٹر۔" اس نے زور سے میز پر مُکا مارا اور چیخنے لگا۔ "نکمے ہو۔ بالکل نکمے... کچھ نہیں آتا تم لوگوں کو......"

اس کے لال مُنہ اور رال بھرے ہونٹوں سے الفاظ بڑی تیزی سے نکل رہے تھے۔ "ابھی میں اپنے ڈاکٹر کے پاس گیا تو وہ بولا کہ علاج کے لئے کئی روز چاہئیں اور اب تم کہتے ہو کہ ہفتہ چاہئے... کیا یہی سیکھتے ہو تم لوگ کہ معمولی بیماری کو لمبا کر دو۔"

"مسٹر جان!" میں حیران بھی تھا اور غصہ میں بھی۔ "اگر تم ڈاکٹر سے علاج کی توقع رکھتے ہو تو ڈاکٹر بھی اپنے مریضوں سے باعزت برتاؤ چاہتا ہے۔"

"اپنے آپ کو ڈاکٹر مت کہو" وہ چلّایا۔ "اگر تم شام تک یہ انگلیاں ٹھیک نہیں کر سکتے تو تم ڈاکٹر نہیں..... ہرگز نہیں۔" اس کے تھوک کے چند قطرے اُڑ کر میرے بازو پر گرے اور آنکھ سے بہتا ہوا پانی رخسار کی جھریوں میں چمک رہا تھا۔ چپٹی ناک سے جھانکتے ہوئے بال اسے اور بھی خشمگیں بنا رہے تھے اور گنجے سر کی چمک کے نیچے غیر ہموار شیو پہ جھرّیاں مچل رہی تھیں۔ لوٹڈر کے بھاری کوٹ میں اس کا بوڑھا جسم اُچھلنے لگا۔ "تمھارے لئے میں ایک مریض ہوں، محض ایک مریض... بالکل عام مریضوں کی طرح ___ لیکن تمہیں کیا پتہ میرا وقت قیمتی ہے ___ بہت قیمتی ڈاکٹر۔ میں کوئی نالائق ڈاکٹر نہیں جو مریضوں کی بیماری کو کھلونا بنا کر وقت گزارتا ہے ___ مجھے کام کرنا ہے.... ڈاکٹر سُن رہے ہو یا نہیں؟"

"میں خوب سُن رہا ہوں مسٹر جان۔ اور سوچ رہا ہوں کہ پہلے تمہاری انگلیوں کا علاج کر دوں یا دماغ کا۔"

وہ اپنی جگہ پہ جیسے منجمد ہو گیا۔ مجھ پہ نظریں گاڑ کر اس نے میرا موڈ جانچا اور پھر گڑگڑایا۔

"اوہ! پلیز ڈاکٹر ___ آئی ایم سوری ___ ویری سوری ___ میرا مقصد گستاخی ہرگز نہ تھا ___ تمہیں میری دماغی حالت کا صحیح اندازہ نہیں ___

بات دراصل یہ ہے کہ مجھے اپنی تصویریں ختم کرتا ہیں اور اس کے لئے میں ایک لمحہ بھی
ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ میں بوڑھا آدمی ہوں تم دیکھتے ہو۔ میری صحت بھی ٹھیک نہیں۔
نہ معلوم اس سال سردی میں کس وقت مرجاؤں۔ ۔ ۔ ۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا
ڈاکٹر۔ ۔ ۔ ۔ لیکن۔ ۔ ۔ ۔ لیکن مرنے سے پہلے تصویریں ختم کرنا چاہتا ہوں۔
پلیز ڈاکٹر۔ ۔ ۔ ۔ اس نے میرے ہاتھ پکڑ لئے۔" مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔"
اس کے موڈ کی یہ تبدیلی کافی حیران کن تھی۔ اور اس سے زیادہ تصویروں
کا ذکر، جس کا اندازہ چند روز پہلے منیجر مجھے دے چکا تھا اس لئے مجھے
دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کچھ اور بولے اس لئے میں نے بظاہر بیزاری
کا بھرم قائم رکھا۔
"دیکھو ڈاکٹر تم ابھی نوجوان ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فرض کرو۔ ۔ ۔ تم اپنی گرل فرینڈ
کو بڑا پیارا خط لکھ رہے ہو اور قلم ٹوٹ جاتا ہے تو تمھیں قلم پر غصہ آئیگا یا نہیں؟"
"آئے گا۔" میں دل میں خوش ہوا کہ وہ صحیح لائن پر آرہا ہے۔
اور پھر وہ غصہ سے دھاڑ اٹھا۔" تو پھر تم میرے ہاتھ کیوں نہیں ٹھیک کر سکتے؟
تم مجھے کیوں نہیں سمجھ سکتے۔ ۔ ۔ ۔ ؟؟ لیکن نہیں۔ ۔ ۔ ۔ اوہ معاف کرنا ڈاکٹر۔۔
سوری ـ سوری۔" وہ خجالت سے ہاتھ ملنے لگا۔ غصّے کی لالی شرم سے بدل گئی۔
وہ محجوب سا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔
"ڈاکٹر اگر میرا قیاس درست تو تم مذہبی خیالات والے آدمی نظر آتے ہو۔ ۔ ۔
تمھیں دعا پر اعتبار ہے نا؟ ہے نا؟؟ اور دعا ہی ایک دُکھے ہوئے دل کی!!۔۔
ڈاکٹر میں تمھارے لئے دعا کروں گا۔ ۔ ۔ بڑی دعا کروں گا۔"
وہ مجسم التجا تھا۔ اس کے چہرے کی جھرّیاں لجاجت سے پھڑکیں اور اس کی دوسری
آنکھ کو بھی بتدریج گیلا ہوتا دیکھ کر میں اپنی ساری انانیت بھول گیا۔ آگے بڑھ کر میں نے
اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور دلاسہ دیتے ہوئے کہا" جان! میں اپنی پوری
کوشش کروں گا۔ انشاء اللہ تم کل صبح تک بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"
"تھینک یو۔ ۔ ۔ سَر! اس کے رُندھے ہوئے گلے سے آواز پھنس کر نکلی اور
بازو اٹھا کر وہ آستین سے آنکھ کا پانی پونچھنے لگا۔

میں نے اسے ایک مرہم لگانے کو دی۔ ایک انجکشن لگایا اور ساتھ ہی اپنا تیر بہدف دیسی علاج آزمایا۔ میں نے کہا کہ رات کو پانی میں شلغم اُبال کر سوتے وقت اس میں گھنٹہ بھر تک اُنگلیاں ڈبوئے رکھے اور پھر ہوا سے بچاتے ہوئے سو جائے۔ وہ دل ہی دل میں اس علاج پر تعجب کرتا چلا گیا۔

دوسرے روز وہ بھاگا ہوا میرے کمرے میں گھس آیا، بچوں کی طرح اُنگلیاں پھیلاتے ہوئے وہ خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ "میری انگلیاں ٹھیک ہو گئی ہیں ڈاکٹر، بالکل ٹھیک . . . . . دیکھو" وہ بار بار مُٹھی بند کرنے اور کھولنے لگا۔

"بالکل ٹھیک . . . . میں برش ٹھیک چلا سکتا ہوں۔" جھٹ سے اس نے سگریٹ نکال کر مجھے پیش کیا۔ اور جب میں جُھک کر اس کے ہاتھوں کے ہالے میں سے سگریٹ سلگا رہا تھا تو وہ بولا۔

میں حیران ہوں ڈاکٹر۔ تم لوگ یہاں طب پڑھنے کیوں آتے ہو جب کہ تمہارے اپنے ملک میں اتنے علاج موجود ہیں۔ میرا ہونق ڈاکٹر کہتا تھا کہ سب کام چھوڑ دو اور بند کمرے میں بارہ روز بیٹھے رہو۔

انگلستان میں دھوپ بارانی نالوں کے طوفان کی طرح ہے۔ کبھی کبھار ایک دم سورج دانت نکال دیتا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دبیز دھند اسے نگل جاتی ہے۔ ایک شام خلاف توقع دن نسبتاً چمکیلا تھا اور میں منیجر کے کمرے سے بالکونی میں اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ سورج کی کرنیں ہلکے سے کُہرے سے لڑتی جھگڑتی ہم تک پہنچ ہی جاتی تھیں۔ اور ہم ہاتھوں سے دستانے اُتار کر انگلیوں پر خوش گوار حدّت محسوس کر رہے تھے۔ بالکونی کے نیچے گھاس سے بھرپور دالان روشنی کی وجہ سے بہت نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔ اور اس کے پرے شیشے کی بڑی کھڑکی میں سے سونی نظر آ رہی تھی جو ڈانسنگ ہال میں کسی "بے لے" (BALLET) کی پریکٹس کر رہی تھی۔ اٹھارہ سالہ سونی بہت حسین لڑکی تھی اور کمر سے نیچے پھیلے ہوئے لباس میں کسی پری کی مانند لہرا رہی تھی۔ بوڑھے منیجر کے ساتھ مشرق اور مغرب کے تضاد کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی جو کہ اس کا محبوب موضوع تھا کیونکہ اس نے اپنی ساری زندگی ہندوستان میں بطور آئی سی ایس کے گذاری تھی۔

"میرے خیال میں مسٹر قریشی، مشرق کی پس ماندگی کے تین وجوہ ہیں۔ ویسے تو وجہ ایک ہی ہے، میرا مطلب ہے غیر ضروری پابندیاں لیکن اس کی تین شکلیں ہیں۔ ایک تو ہیں شوشل اقدار کی پابندیاں۔ آپ کی زیادہ تر قدریں منفی ہیں۔ آپ کے معاشرے میں لفظ "نہ" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ نہ کرو ــــ وہ نہ کرو۔ ایسا نہ کرو وغیرہ۔ دوسری چیز ہے فیملی سسٹم کی پابندیاں۔ وہاں کے گھریلو نظام میں بلاشبہ اچھی باتیں بھی ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ اتنا سخت گیر ہے کہ بیشتر لوگوں کی شخصیت مسخ ہو جاتی ہے اور تیسری چیز ہے مذہب کی بگڑی ہوئی شکل۔ اور اس پر بنائی ہوئی اقدار جو اس قدر سخت گیر ہیں کہ فرد کچل جاتا ہے۔۔ یعنی یہ میرے اپنے مشاہدات ہیں، ممکن ہے آپ متفق نہ ہوں میرا خیال ہے کہ۔۔۔۔"

"معاف کرنا مسٹر وائن۔۔۔۔" میں نے چور نظروں سے سوزی کی پتلی کمر اور گداز سینے کی طرف دیکھتے ہوئے بات کاٹی۔ "مجھے آپ کی بات سے سو فی صدی اتفاق ہے لیکن۔۔۔۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جو آپ بھول رہے ہیں۔۔۔۔ اور وہ ہے مغرب کی ریشہ دوانیاں جس نے مشرق کو ادھ موا کر دیا ہے اور ہماری خوبیوں کو ہماری ہی نظر میں مشکوک بنا دیا ہے۔"

مینیجر ہر انگریز کی طرح اس بات پر جذباتی ہو جاتا تھا اس لئے اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ وہ خفگی سے کچھ کہنے کو ہی تھا کہ مس ٹیلر پاؤں پٹختی کمرے میں آئی اور بالکونی میں آ کر تیزی سے بولی:

"مسٹر وائن! اس بوڑھے پاگل کو میرے سیکشن سے ہٹا لو۔ میں ایک منٹ بھی اس کے ساتھ کام نہیں کر سکتی۔۔۔۔ ایڈیٹ کہیں کا۔" وہ غصے میں بھول گئی کہ مینیجر سے بات کر رہی ہے۔

"کیا قصہ ہے مس ٹیلر؟ کس بوڑھے کا ذکر ہے؟" مینیجر حسب معمول بڑے ٹھنڈے انداز میں بولا اور بجلی کے ہیٹر پر اپنے ہاتھ پھیلا دئے۔

"میں جان کی بات کر رہی ہوں، مسٹر وائن۔۔۔۔ وہ میرے ساتھ بالکل تعاون نہیں کرتا ــــ بلکہ صریحاً گستاخ ہے۔ سب کے سامنے میری بے عزتی کرتا ہے ــــ میرا سارا ڈسپلن خراب کرتا ہے ــــ میں اب اسے برداشت نہیں

مینیجر نے غصیلی عورت سے نمٹنے کا آخری حربہ استعمال کیا اور اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا۔
میں نے موقع غنیمت جان کر ڈائننگ ہال کی طرف نگاہ ماری۔ سونی ایک ٹانگ فضا میں اٹھائے، جسم کو زمین کے متوازی پھیلائے دوسرے پنجے پر لٹو کی طرح گھوم رہی تھی۔

"بات یہ ہے مسٹر وائن کہ آج وہ تصویر بنا رہا تھا اور آسمان پر نیلا رنگ چڑھانے لگا تو میں نے کہا کہ یہاں ہلکے سبز رنگ میں اودا رنگ ملا کر لگاؤ تو نیچے کی زمین زیادہ نکھری معلوم ہوگی۔ لیکن کہنے لگا کہ جب تم اپنی تصویر بناؤ گی تو جو چاہے کر لینا۔ مجھے اپنی مرضی کا رنگ لگانے دو۔ جب میں نے سمجھانا چاہا تو کہتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ بوڑھی چڑیل ۔ ۔ ۔ ۔ ! میں یہ ہرگز ۔ ۔ ۔ ۔ "

"اوہ! یہ بات ہے" مینیجر نے اخبار ایک طرف رکھ کر سگریٹ کا لمبا کش لیا۔
"ادھر تشریف رکھئے مس ٹیلر ۔ ۔ ۔ ۔ بیٹھئے ۔ ۔ ۔ ۔ بیٹھئے بھی!"

مس ٹیلر کا سپاٹ سینہ غصے سے ہانپ رہا تھا اور وہ بیٹھنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ مینیجر نے سگریٹ بجھا کر ایش ٹرے میں ڈال دیا اور مس ٹیلر کو ابھی تک کھڑے دیکھ کر کہنے لگا۔

"یہ واقعی اس کی حماقت ہے کہ ایک جوان حسین لڑکی کو بوڑھی چڑیل کہہ رہا ہے"
مس ٹیلر کے ناراض چہرے پر خفیف مسکراہٹ اور سرخی کی ہلکی سی لہر لمحہ بھر کو دوڑی اور وہ قدرے نرم ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"دیکھئے مس ٹیلر" مینیجر سمجھانے لگا "میں جانتا ہوں جانی بدتمیز بھی ہے اور جذباتی بھی لیکن آپ کو پتہ ہونا چاہیئے کہ ساٹھ برس کا بوڑھا بالکل بچے کی مانند ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ بچہ جسمانی آرام مانگتا ہے اور بوڑھا ذہنی سکون لیکن اس کے مانگنے کا طریقہ دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے یعنی ضد، جذباتی پن اور غصہ۔ اور بحیثیت اس سکیشن کے انچارج کے تمہارا فرض ہے کہ ہر آدمی سے اسی کے مزاج کے مطابق برتاؤ کرو ۔ ۔ ۔ ۔ "

"وہ تو میں کرتی ہوں لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ "

"میری بات سن لو مس ٹیلر" وہ اپنی جیب ٹٹولنے لگا "ہمیں ویسے بھی اس کے شوق کی قدر کرنی چاہیئے۔ ساٹھ سال کا بوڑھا جس کی ایک آنکھ پتھر کی ہے اس تندہی سے کام کرتا ہے۔ یہ ہمارے ساتھ میڈیکل آفیسر بیٹھے ہیں ان سے پوچھ لو اس قسم کے آدمی کے

کر سکتی۔ یا آپ اُسے اسکول سے نکال دیں ورنہ میں ملازمت چھوڑ دوں گی۔"

مس ٹیلر مغرب کی ان مظلوم عورتوں میں سے تھی جنھیں وہاں کی نکتہ چیں سوسائٹی قدرت کی لاپروائی کی سزا عمر بھر دیتی رہتی ہے۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ بدصورت اور لاغر پیدا ہوئی تھی جو کہ وہاں کے کورٹ شپ والے نظام میں ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ بھڑکیلے اور سُبک تراش والے لباس اور میک اَپ کے سائنٹفک طریقے بھی اس جرم کی تلافی نہ کر سکے۔ وٹامن کے انجکشن اس کی لوک دار ہڈیوں پر گوشت نہ چڑھا سکے اور ربڑ کی چھاتیاں اور پلاسٹک کے کولھے اس کے حسن کو وہ بلندیاں نہ دے سکے جن پر سے ملاقاتی مرد پھسل کر خاوند بن جاتے ہیں۔ اس کی زندگی میں ہر پھل کا مزہ چکھ کر آگے بڑھ جانے والے مرد آئے تھے اور یا پھر وہ جو ڈانسنگ ہال میں عورتوں کی کمی کی وجہ سے اس کے ساتھ ڈانس کرنے اور ایک آدھ ڈرنک زہر مار کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ خاوند کی تلاش اس کا مسلسل روگ بن رہی تھی اور اب بالکل ناامید ہو کر چالیس برس میں وہ کسی چھوٹے قصبے کے ریلوے اسٹیشن کی طرح تھی جہاں سے تھوڑی دیر پہلے میل ٹرین دنادن کر کے گزر چکی ہو اور اب جھنڈی ہلانے والا بھی کوئی نہ ہو۔ اب وہ بڑی چڑچڑی تھی اور جذبات کے مسلسل ہیجان کے بعد جو ٹھہراؤ اس کی طبیعت میں آیا تھا وہ مردوں سے نفرت کی صورت اختیار کر گیا تھا اس لئے وہ بھی بے چارے جان پر اس کی خطا سے بہت زیادہ برستی رہتی تھی اور منیجر اس بات کو خوب سمجھتا تھا۔

"آخر ہوا کیا ہے؟" منیجر سگریٹ سلگانے لگا۔

"وہ بدتمیز ہے، جاہل ہے، گدھا ہے۔ ۔ ۔ ۔"

"وہ تو میں جانتا ہوں مس ٹیلر کہ آپ کافی گدھا شناس ہیں۔ لیکن آج کیا ہوا؟"

"اسے تمیز نہیں کہ عورتوں سے کیسے بات کرتے ہیں۔" مس ٹیلر نسوانی غصّے کے اس نقطے پر پہنچ گئی تھی جہاں کان بند ہو جاتے ہیں اور زبان کھل جاتی ہے۔ "میں کوئی گری پڑی عورت نہیں۔ اس سیکشن کی انچارج ہوں اور دس سال سے اسی اسکول میں کام کر رہی ہوں۔"

لئے ایک آنکھ سے کام کرنا کتنا تکلیف دہ ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ جان توڑ کر کام کرتا ہے۔"

منیجر نے پائپ نکالا اور اس میں تمبا کو جمانے لگا۔

"ویسے بھی مس ٹیلر۔ ہمارے اسکول کا مقصد لوگوں کے فارغ اوقات کا مفید استعمال کرنا ہے اس لئے جب لوگ یہاں آئیں تو ان کو یہ محسوس نہیں ہونا چاہئے کہ وہ کوئی کام خلاف مرضی کر رہے ہیں بلکہ یہ ان کے لئے ایک تفریح ہونی چاہئے۔ . . . بائی دی وے — مس ٹیلر! آپ اس بوڑھے کے ماضی کے بارے میں کچھ جانتی ہیں ؟"

"نہیں مسٹر وائٹ . . . اور نہ ہی میرا خیال ہے کہ اس کے ماضی کا علم میری عقل میں کچھ اضافہ کرے گا۔"

"ضرور کرے گا مس ٹیلر!" منیجر نے پائپ میں دیا سلائی لگا کر سانس اندر کھینچا تو دیا سلائی کا شعلہ تمبا کو پر جا چپکا۔ اس نے دھوئیں کے دو تین بھبکے چھوڑے۔ شاید تمھیں معلوم نہیں کہ یہ انڈین فوج میں افسر تھا، وہاں سے میجر ریٹائر ہوا تھا اور یہ بہت عمدہ افسر تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں اس بے جگری سے لڑا کہ اسے تین بار بہادری کے تمغے ملے اور سب سے بڑا تمغہ تو اس کی پتھر کی آنکھ ہے جو اس نے امپھل کے مورچہ پر لڑتے ہوئے گنوائی . . . . یہ تمبا کو بہت عمدہ ہے مسٹر قریشی۔ اگر پائپ پیتے ہو تو ضرور استعمال کرنا . . . . لڑائی کے میدان میں اس نے کبھی اپنی جان کی پروا نہیں کی۔ اسی لئے یہ کمانڈو دستوں کا انچارج ہوتا تھا جو بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ . . . یہ ہماری فوج کی ناک تھا اور ایسے لوگوں کا اسکول میں آنا باعثِ عزت ہے . . . یہ پائپ بھی عجیب مصیبت ہوتا ہے بار بار بجھ جاتا ہے۔

وہ ماچس ڈھونڈنے لگا۔ میں نے لائٹر جلا کر آگے کیا۔

"تھینک یو ڈاکٹر۔" دھوئیں کے غلاف میں سے میری طرف کنکھیوں سے دیکھتا ہوا بولا۔ "ہمیں ایسے لوگوں پر فخر ہے مسٹر قریشی جن کی وجہ سے انگریزی سلطنت دنیا بھر میں پھیلی رہی۔" وہ میری گزشتہ دلیل کا بدلہ لے رہا تھا۔

"آپ کو اپنے سیکشن میں کام ہو گا مس ٹیلر . . . آپ جان کو دو بجے میرے پاس بھیج دیں، تو میں اسے سمجھا دوں گا کہ آئندہ آپ کے ساتھ عزت سے پیش آیا کرے اور بدتمیزی نہ کرے۔"

"مس ٹیلر ڈھیلے قدموں سے دروازے کی طرف ایسے چلی جیسے ایک بچہ قلفی والے کو بٹھا کر باپ سے پیسہ مانگنے آتا ہے تو باپ پیسہ دینے کی بجائے گھرک دیتا ہے۔

◎

یوں ہی دروازہ کھول کر میں اسکول میں داخل ہوا، گرم فضا نے میرے منجمد چہرے کو خوش گوار لپیٹ میں لے لیا۔ سردی سے سُن ہوئے ناک میں کوئی یخ بستہ رگ گرم ہو کر نرمی سے پھیلی اور میں بے اختیار چھینک دیا۔ ٹھنڈے چہرے پر گرم سکون ہولے ہولے چھٹنے لگا اور میں سینٹرل ہیٹنگ سسٹم کو دعائیں دیتا ہوا ڈفل کوٹ پر سے برف جھاڑنے لگا۔ کلوک روم میں جا کر کوٹ اور ٹوپی اُتار کر ٹانگے اور لاؤنج کی طرف لپکا جس کے کونے میں کینٹین تھی اور مجھے گرم گرم کافی کی سخت طلب تھی۔

لاؤنج کا دروازہ سارا شیشہ کا تھا اور داخل ہونے سے پہلے میں نے دیکھا کہ ایک گول میز پر سوزی ٹانگیں لٹکا کر بیٹھی ہے اور لڑکے لڑکیاں، مرد عورتیں اس کے گرد کرسی، اسٹول، صوفے، فرش وغیرہ پر بیٹھے ہیں۔ دروازے سے باہر آواز تو نہ آتی تھی گو یہ پتہ چلتا تھا کہ سب مل کر گا رہے ہیں۔ سوزی سر کے ساتھ ٹانگیں ہلا رہی تھی اور اپنے ٹھنڈے چہرے کو چھوتا ہوا میں ایک دفعہ پھر حیران ہوا کہ یورپی عورتیں اتنی ٹھنڈک میں صرف نائلون کی پتلی جرابوں سے ٹانگیں ڈھاک کر نہ معلوم کیسے گرم رہتی ہیں۔ سوزی میرے اس خیال سے بے خبر گانے میں مصروف تھی۔ پہلے وہ بازو ہلا کر مصرعہ اٹھاتی اور پھر سب مل کر کورس گاتے۔ جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا۔ سب کا کورس فضا میں اُبھرا۔

It is a jolly saturday evening And I have no girl with me!

میں کافی کی پیالی ہاتھ میں لئے آتشدان کے قریب چلا گیا اور کافی کی چسکیاں لیتا ان کے گانے سنتا رہا۔ بوڑھے بچے، جوان سبھی بے خود ہو کر گا رہے تھے۔ پیٹر اپنا باجہ منہ سے بجا رہا تھا۔ سوزی آج سرخ رنگ کا فراک پہنے تھی اور گلے میں پیلی دھاری والا کالا مفلر تھا۔ سُر کی تال پر جھٹکنے سے بھورے بال خوب صورتی سے لہراتی ہوئی چٹک کے ساتھ ہلتے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اس علاقے میں سوزی یقیناً سب سے حسین لڑکی ہو گی۔ کافی ختم کر کے میں ان کے گانے

سُنتا رہا۔ میرا دل بھی چاہا کہ ان کی طرح گاؤں اور خوشی میں بھول جاؤں لیکن مشرقی شرم مانع رہی۔ جب میں باہر نکلنے لگا تو جان کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر "ہلو ڈاکٹر!" کہا اور ٹھٹھک کر سونی کو دیکھنے لگا۔ خوب صورتی میں کتنی کشش ہے۔ میں نے سوچا۔ سوکھے دھانوں میں بھی پانی پڑ جاتا ہے۔ لیکن دروازے سے نکلنے سے پہلے میں بھی مُڑ کر سونی کو دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ اب صوفے کی ٹیک کا سہارا لئے کسی یونانی دیوی کی طرح دونوں ہاتھ فضا میں اُٹھا کر گا رہی تھی اور باقی سب لوگ آواز ملا رہے تھے۔

Sugar in the morning, Sugar in the evening, Sugar at the supper time.
Be my little sugar, And love me all the time.

میں نے دروازہ بند کیا تو ان کی آواز لوری کے بول کی طرح نیند میں ڈوب گئی۔

اپنے کمرے میں جا کر میں نے دو ایک بوڑھی عورتوں کو انجکشن لگایا اور پھر کوئی نصف درجن مریض دانتوں کے تھے۔ وہاں ٹافی کھا کھا کر لوگوں کے دانت بچپن میں ہی خراب ہو جاتے ہیں اس لئے زیادہ تر لوگ دانت کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ایک بوڑھی عورت کو بیٹھ کر یہ یقین دلاتا رہا کہ اسے کوئی بیماری نہیں اور جس خارش کی وہ شکایت کرتی ہے وہ باتھ ٹب میں بہت سی دوائیاں ملانے سے ہوتی ہے۔ لیکن وہ چاہتی تھی کہ اسے کوئی بیماری ہو تاکہ وہ ہر راہ چلتے سے اس کا دکھڑا رو سکے۔

کافی دیر بعد جب میں نیچے اُتر رہا تھا تو جھگڑے کا شور کان میں پڑا۔ نیچے پہنچا تو لاؤنج میں ہنگامہ برپا تھا۔ مس ٹیلر کی آواز سب سے کان میں پڑی۔ "یو سوائن..... ایڈیٹ...." الیگزینڈر اور پیٹر مل کر جان کو دھمکا رہے تھے۔ کبھی بازو کھینچتے، کبھی سے چلے جانے کو کہتے۔ میں جانتا تھا یہ دونوں سونی کے چاہنے والے ہیں اس لئے ضرور کوئی بات ایسی ہوئی ہے جس سے سونی کا تعلق ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو دور صوفے پر سونی بیٹھی تماشہ دیکھ رہی تھی۔

جان اپنے چہرے سے آنکھ کا پانی پونچھتا ہوا اونچے اونچے بول رہا تھا۔ "تم سب خود غرض ہو تمھیں میری ضرورت کا احساس نہیں۔" اس نے غصے میں زور سے میز پر مُکا مارا اور پھر چوٹ لگنے سے ہاتھ ملنے لگا۔ سب بچے تالیاں بجا کر اس کا مذاق اُڑانے لگے۔

اور جان کی باتیں شور میں دب گئیں۔ ایک بات صاف تھی کہ سب لوگ جان کے خلاف ہو رہے تھے۔
شور کے بتدریج کم ہونے سے مس ٹیلر کی آواز اُبھرتی چلی گئی۔ ..."جانی... بے شرم ... تنگ کرتے تھے... تمہارا پاگل پن میرے سیکشن میں موجود تھا۔ تم یہاں گزر کرتے تھے۔ اب اگر تم نے دوسروں کو تنگ کرنا شروع کر دیا تو یاد رکھنا اسکول سے نکال دیے جاؤ گے۔"

"ختم کرو یہ بک بک۔" جان چلایا۔ "میں کسی کو تنگ نہیں کر رہا، میں تو صرف سونی کی تصویر بنانا چاہتا تھا۔"

"اگر وہ نہیں چاہتی تو تمھیں کوئی حق نہیں کہ اسے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دو۔" مس ٹیلر حسبِ معمول جان پر برس رہی تھی۔

سونی دھیرے دھیرے آگے آئی اور جان کے قریب پیٹر اور الیگزینڈر کے درمیان کھڑی ہو گئی۔ پھر ایک ایک ہاتھ دونوں کے کندھوں پر رکھ کر الفاظ چبا چبا کر بولی۔ "میری جوانی اتنی ناکارہ نہیں ہے کہ اس کے حسین لمحات ایک بدصورت اور غلیظ بوڑھے کے سامنے بیٹھ کر گزار دوں۔ اس نے اپنا رُخسار پیٹر کے کندھے پر ٹکا دیا اور ہاتھ الیگزینڈر کی کمر میں ڈال دیا۔

"ہیئر، ہیئر!" الیگزینڈر نے تالی بجائی اور سونی کا ہاتھ پکڑ کر راک این رول کرنے لگا۔ پیٹر نے جھٹ سے جیب سے منہ کا باجا نکالا اور میوزک بجانی شروع کی۔ اگلے لمحے سب لوگ کرسیوں کے درمیان ڈانس کر رہے تھے اور اُچھل کود رہے تھے۔

لیکن جان جیسے سُن ہو گیا۔ بے جان بُت بنے اس نے غصے کا ایک گھونٹ کوشش کر کے نگلا اور پھر انگلی سے آنکھ کا پانی صاف کرنے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "آؤ جان ہم باہر چلیں۔" اِدھر اُدھر ناچتے ہوئے لوگوں میں سے جب میں اسے نکال رہا تھا تو وہ رسے سے کھینچی جانے والی خراب موٹر کی طرح بلا دقت میرے ساتھ کھنچا چلا آیا۔ اس کے مجروح جذبات دیکھ کر میں نے پوری بات پوچھنا مناسب نہ سمجھا، فقط اتنا کہا: "جان سونی بہت مغرور ہے۔ اسکول میں اور بہت سی حسین لڑکیاں ہیں، تم ان میں سے کسی کی تصویر بنا لو۔"

"خوب صورت لڑکیاں ہاں... ہیں تو! لیکن لیکن اس جیسی کوئی نہیں۔" بات اس نے میرے دل کی کہی تھی اس لیے میں خاموش ہو گیا۔

جان اسی طرح سوچنے کے انداز میں بول رہا تھا۔

"اس جیسی کوئی نہیں۔ ۔ ۔ سونی بالکل اسی کی طرح ہے۔"

تو یہ کسی اور کا سوچ رہا ہے۔ بہر حال میں خاموش رہا۔

"ڈاکٹر!" اس نے میرے کندھے پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا۔ "یہ لوگ میری بات نہیں سمجھ سکیں گے۔ ۔ ۔ کبھی بھی نہیں سمجھ سکیں گے۔ تم ذرا آؤ میرے ساتھ آرٹ سیکشن تک۔ ۔ ۔"

میں خاموشی سے ساتھ ہو لیا۔ مجھے دیر ہو رہی تھی لیکن اس واقعہ کے بعد اس کے چہرے پر ایسی بے بسی برس رہی تھی کہ میں مزید صدمہ نہ پہنچانا چاہتا تھا۔ ہم نے پہلے برآمدے کو پار کیا۔ پھر وہ سیڑھیوں پر میرے آگے آگے نیند میں چلنے والے مریض کی طرح چڑھتا گیا۔ اوپر والا برآمدہ چل کر ہم آرٹ سیکشن میں چلے گئے۔ کمرے میں کوئی بھی نہ تھا۔ میں ٹیبل کے نیچے اپنی فتح منا رہی تھی۔ ڈسکوں اور بورڈوں کی قطاروں میں سے گزر کر ہم وہاں پہنچے جہاں بورڈ پر جان کا کینوس چسپاں تھا اور اس پر ایک نامکمل تصویر تھی۔

اس نے اپنے سامان والا دروازہ باہر کھینچا اور ایک تصویر نکال کر مجھے دی جو وہ مکمل کر چکا تھا۔ تصویر میں برف گرنے کا سماں تھا۔ اوپر بادلوں بھرا مٹیالا ناہموار آسمان، نیچے چمکیلی سفیدی، ہر چیز پر سفید چھت منظر ایک پارک کا تھا جس میں درخت، بینچ، پھولوں کے گرد جنگلوں وغیرہ ہر شے پر سفید تہہ تھی۔ فضا میں برف کے گالے اُڑ رہے تھے اور ایک درخت کے نیچے ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی بھاری کوٹ پہنے آپس میں چمٹے بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے اتنے قریب تھے کہ ایک کا سانس دوسرے کے چہرے پر جم رہا تھا اور وہ ٹکٹکی باندھے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ تصویر کے کونے میں تاریخ لکھی تھی ۱۷ر فروری ۱۹۱۷ء۔

"بہت عمدہ تصویر ــــ جان کب ختم کی تم نے۔" میں تصویر کی تعریف کئے بنا نہ رہ سکا۔

جان تھکے ہوئے مسافر کی طرح اسٹول پر بیٹھ گیا اور نحیف آواز میں بولا۔ "یہ تمہارے لئے محض ایک تصویر ہے ڈاکٹر۔ ایک منظر، لیکن میرے لئے یہ مسٹری ہے۔ یہاں میں نے اسے پہلی دفعہ پیار کیا تھا۔ ۔ ۔ ٹھنڈے ہونٹوں کا گرم پیار۔"

اس نے دوسری تصویر میرے ہاتھ میں دے دی۔ یہ غروب آفتاب کا منظر تھا۔ افق پر سورج کی سنہری ٹکیہ کا نچلا کنارہ سمندر سے چھو رہا تھا۔ آسمان پر مٹیالے بادل ارغوانی جھالروں میں گھرے تھے اور نیچے دو بڑی پہاڑیوں کے درمیان سمندر نظر آرہا تھا جس پر ایک کشتی میں دو سواروں کا سیاہ خاکہ سورج کی روشنی کو کاٹ رہا تھا۔ کپڑوں اور بادلوں کی تراش سے اندازہ ہوتا تھا کہ ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ سمندر پر پرندے اُڑ رہے تھے اور سارے ماحول پر سرخ روحانیت چھائی ہوئی تھی۔ تصویر کے کونے میں تاریخ درج تھی ۳۰ رمارچ سنہ ۱۹۱۹ء۔

"روم میں ہم پوپ سے دعا لے کر کیپری کے جزیرے پر چلے گئے تھے . . . یہ میں بیٹھا ہوں۔" اس نے کشتی کے مسافروں پر انگلی رکھ کر کہا اور ساتھ ایلن ہے . . ."

وہ دونوں پر انگلی پھیرنے لگا۔

"ڈاکٹر!!" "تم کوئی آواز سُن رہے ہو؟"

"نہیں تو!" میں نے حیران ہو کر چاروں طرف دیکھا۔

وہ زیرِ لب ہنسا۔ "لیکن میں سُن رہا ہوں . . . . ایلن مجھ سے کہہ رہی ہے کہ ہم لندن واپس جا کر شادی کر لیں گے۔"

اس نے تصویر میرے ہاتھ سے لے لی اور چہرے کے قریب لے جا کر غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بڑے پیار سے دونوں تصویریں دراز میں رکھ دیں اور بورڈ والی نامکمل تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔

"اور یہ ہے لندن۔"

نامکمل تصویر کے کچھ حصے میں رنگ بھر دیا گیا تھا۔ درمیان میں خالی حصہ تھا۔ یہ ایک ڈانسنگ ہال کا منظر تھا۔ موم بتیوں کی روشنی میں ہونے والا مدھم ڈانس، دو ایک جوڑے فرش پر ڈانس کر رہے تھے باقی دیوار کے قریب کرسی میزوں پر بیٹھے ڈرنکس پی رہے تھے۔ ہر میز پر ایک موم بتی جل رہی تھی اور ایک میز پر ایک لڑکا اکیلا بیٹھا تھا۔ موم بتی کی ناکافی روشنی سے اس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ بہت اُبھر آئے تھے اور ٹھوڑی ہاتھ میں لیے، کہنی میز پر ٹکائے وہ بڑی حسرت سے ایک ناچنے والے جوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

اس جوڑے کی ڈرائنگ ابھی مکمل نہ تھی۔ پنسل سے خاکہ بنایا گیا تھا اور اس میں بھی بار بار تصحیح کی گئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ مصوّر لڑکی کا چہرہ اور لباس سب کچھ دکھانا چاہتا تھا لیکن والز کا پوز ایسا تھا کہ اسے مشکل پیش آ رہی تھی اس لئے پنسل کے رف خاکے سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ بار بار ربڑ لگنے سے کاغذ کھردرا ہو گیا تھا اور مٹی ہوئی لکیروں کے دھندلے نقوش باقی تھے۔

"یہ میں ہوں۔" اس نے میز کے قریب بیٹھے ہوئے آدمی پہ انگلی رکھی۔ "لوروز کے ڈانسر ہیں۔"

وہ خاموشی سے تصویر کو دیکھنے لگا۔

"یہ ایلین اور ڈیوڈ ہیں۔" اس نے نامکمل جوڑے کو چھوا۔

ایلین نے اس رات سُرخ فراک اور کالا مفلر پہنا ہوا تھا اور آج جب میں لاؤنج میں گیا تو میں نے دیکھا کہ ایلین صوفے کا سہارا لئے کھڑی گا رہی ہے۔ آج رات پہلی دفعہ میں نے سونی کو غور سے دیکھا —— وہ ایلین ہے ڈاکٹر —— بالکل ایلین —— اس نے مجھے دھتکارا ابھی اسی رات کی طرح ہے جب وہ کافی دیر ڈیوڈ کے ساتھ ڈانس کر چکی تھی۔

"ڈیوڈ کون تھا جان؟"

"جس نے ایلین سے شادی کر لی۔"

چند لمحے بے چین خاموشی رہی۔ جان کا سانس گونجتا رہا۔

"میں کئی روز سے ایلین کا وہ پوز بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب وہ بے خودسی ہو کر ڈیوڈ کے ساتھ ڈانس کر رہی تھی۔ لیکن مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ اگر آج سونی چند منٹ کے لئے وہ پوز بنا دیتی تو میری تصویر آج ہی مکمل ہو جاتی . . . . . آج ہی مکمل ہو جاتی۔" وہ سوچنے لگا۔

"آؤ جان تمہیں کافی پلا لاؤں۔"

جان نے دونوں بازوؤں میں منہ چھپا کر سر میز پہ ٹکا دیا اور بولا۔ "ڈاکٹر خدارا مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

اگلے روز میں نے آرٹ سیکشن میں جھانکا تو جان کی سیٹ خالی۔ دوسرے روز وہ پھر غیر حاضر تھا۔ تیسرے روز پتہ چلا کہ وہ بیمار ہے اور اسکول نہیں آ سکتا ہے۔

میں نے منیجر سے کہا کہ وہ دفتر میں سے اس کے گھر کا پتہ نکلوا دے۔

"کیوں؟" منیجر ایک لڑکی کے والدین کو شکایتی خط لکھتا ہوا رک گیا۔

"وہ بیمار ہے اور میں ذرا جا کے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے آپ لوگوں میں یہ فرض شناسی دیکھ کر بہت مسرت ہوتی ہے ڈاکٹر۔" اس نے انگریز قوم کے مخصوص لہجے میں کہا جو بظاہر بہت میٹھا اور بے ضرر لیکن دراصل طنز سے بھرپور ہوتا ہے اور جس لہجے میں وہ دوسری قوموں سے بات کرتے وقت تعریفی الفاظ میں ان کی تضحیک کرتے ہیں۔

"اگر یہاں کے لوگ مغربی برتری کے تعصب کو بھول کر ہمیں دیکھیں مسٹر وائن تو آپ کو ہماری قوم کے لوگوں میں اور بھی بہت سی خوبیاں نظر آ جائیں گی۔" میں اس کی مسکراہٹ میں پوشیدہ طنز برداشت نہ کر سکا۔

"یقیناً ـــــ یقیناً" مجھے مقابلہ میں آمادہ دیکھ کر وہ اپنی قوم کے کردار کے عین مطابق فوراً صلح پر اتر آیا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے پتہ مل گیا اور میں ڈفل کوٹ کو اپنے گرد لپیٹتا، ہاتھوں کو دستانوں میں ٹھونستا اس کے گھر پہنچ گیا گھنٹی بجائی تو ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا۔

"ایوننگ ... مسز جان!" میں نے جھجکتے جھجکتے اپنا قیاس لگایا۔

"کھی کھی ..." بڑھیا بے تحاشہ ہنسنے لگی "کھی کھی .. .. کھی۔"

میں پہلے تو کھسیانہ ہوا پھر مجبوری کی ہنسی ہنسنے لگا۔

"کھی کھی ... کھی کھی ... مسز جان؟ ... کھی کھی کھی ... مسز جان ... کھی کھی عجیب بات ہے کھی کھی؟"

"میں اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں، جس کا مجھے علم نہیں۔"

وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی اور اور بے دم ہوتے ہوئے اس نے اسی طرح ہاتھ ہلایا جس کا مطلب تھا کوئی گستاخی نہیں۔ بالکل نہیں۔ بڑی مشکل سے پیٹ دبا کر اس نے ہنسی روکی اور کہنے لگی۔ "میرا خیال تھا کہ تم ایسی غلطی نہیں کرو گے کیونکہ گزشتہ چار سال میں جب سے وہ میرے پاس رہ رہا ہے تم پہلے انسان ہو جو اس سے ملنے آئے ہو۔ اس لئے میرا قیاس تھا کہ اس کے گہرے دوست

ہو گے اور جانتے ہو گے کہ میں اس کی بیوی نہیں۔"

"اوہ آئی ایم سوری میڈم . . . . ویری ساری۔"

"کوئی بات نہیں ـــــ جب پہلے گھنٹی بجی تو میں نے سمجھا درزی آیا ہوگا کیونکہ اس نے مجھے وقت دیا تھا۔ میں نے لوٹی کے کپڑے سلنے کو دیئے تھے۔ اس دفعہ کرسمس کے لئے خاص طور پر لال رنگ لائی تھی۔ میں خود گئی تھی برٹن کے ہاں کپڑا دیکھنے . . . گڈ گاڈ . . . بڑی بھیڑ تھی اس روز بھی۔ بارش میں بھیگی ہونے کی وجہ سے مجھے بار بار لوگوں سے معافی مانگنی پڑتی . . . دیکھونا میں بس ویسے ہی اپنی چھتری بھول گئی تھی ؟ بات یہ ہوئی تھی کہ پڑوس سے مس لونرس آئی تھی اور میں بات کرتے کرتے باہر نکل گئی تھی اور چھتری کا خیال ہی نہ رہا ـــــ دراصل میں اس کے کوٹ کے سُرخ رنگ کو ذہن میں بٹھا رہی تھی . . . ."

میں پہلے تو سُنتا رہا، پھر خیال آیا کہ میری مخاطب ایک تو عورت ہے اور دوسرے بوڑھی اور یہ دونوں چیزیں صبر سے سُننے والوں کے حق میں بہت بری ہیں اس لئے جلدی سے قدم بڑھاتے ہوئے میں نے کہا "معاف کرنا میڈم مجھے ذرا جلدی ہے، میں جان سے چند لمحے کے لئے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اوہ ضرور ـــــ ضرور ـــــ شوق سے آؤ بیٹا ـــــ" وہ آگے سے ہٹ گئی، میں اندر داخل ہو گیا۔

"سیدھے اوپر چلے جاؤ ـــــ دائیں ہاتھ کا پہلا دروازہ اسی کا ہے . . . میں تو اس لئے ہنس رہی تھی کہ تم مجھے ایسے خبطی کی بیوی بتا رہے ہو جس نے ساری عمر شادی ہی نہیں کی . . . کبھی . . . . کبھی کبھی . . . ."

میں دامن سمیٹ کر سیڑھیاں چڑھا۔ چھوٹی سی گیلری گزرا اور جب جان کا دروازہ انگلی سے کھٹکھٹایا تو نیچے سے اس عورت کی ہنسی کی آواز ابھی تک آ رہی تھی۔

"آجاؤ ـــــ" جان کی گھٹی ہوئی آواز آئی۔

"ہلو جان ! کیا حال ہے تمھارا" میں نے داخل ہو کر پوچھا۔

"تم آگئے . . . . مجھے یقین تھا تم آؤ گے میرے بیٹے !" جان کمبلوں کے بھاری بوجھ میں سے سر نکالتا ہوا بولا۔ "میں تو بستر میں ہوں۔ تمہارے لئے کمرہ ٹھنڈا ہو گا۔ گیس جلا لو . . . . یہ میز پہ ماچس پڑی ہے۔"

میں نے دیا سلائی جلا کر گیس کی ٹونٹی کھولی تو بھپ سے ہیٹر جل گیا۔ میں قریب ہی بیٹھ کر ہاتھ تاپنے لگا۔ تھوڑی دیر تک موسم کے بارے میں بات چیت کرتا رہا جو انگلستان کی ہر گفتگو کی تمہید ہوتی ہے اس کے بعد کافی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ لیکن جاؔن نے گزشتہ جھگڑے کے بارے میں کوئی بات چیت نہ کی حالانکہ وہی اس کی بیماری کی وجہ تھا اور میرے وہاں جانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ بات چیت سے اس کے دل کا غبار ڈھل جائے۔ لیکن اس موضوع پر آنے کا کوئی موقع ہی نہ بنتا تھا اور میں عادتاً کسی شخص سے براہ راست اس کی ذات سے متعلق سوال کرنے سے ہمیشہ کتراتا ہوں۔

"تمھاری لینڈ لیڈی بہت خوش مزاج ہے جاؔن"۔ میں نے ویسے ہی بات کی۔ "وہ جو روائتی لینڈ لیڈی کا خوفناک تصور ہے یہ اس کے بالکل اُلٹ ہے۔"

"ہاں یہ سچ ہے، واقعی بہت عمدہ عورت ہے۔ میری بڑی سیوا کرتی ہے۔ کھانا پینا، پہننا وغیرہ ہر چیز میں میرا خیال رکھتی ہے، نہ صرف یہ بلکہ ایلنؔ کی خبر بھی مجھے اس نے لادی تھی۔"

"تو ایلنؔ یہاں ہے کیا؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"ہاں! وہ یہاں کے اولڈ پیپلز ہوم میں ہے۔"

"تو پھر تم اُسے اکثر ملتے ہوگے؟"

جاؔن ہنسنے لگا۔ "میں تو اُسی روز ملوں گا جب میری تصویر مکمل ہوگی۔ نہ معلوم وہ کتنا عرصہ لے، یا شاید ہو ہی نہ سکے۔ ایلنؔ بھی بوڑھی ہے، میں بھی بوڑھا ہوں، کیا معلوم کس وقت زندگی ختم ہو جائے۔ اسی لئے تو میں یہ تصویر جلد از جلد ختم کرنا چاہتا ہوں لیکن وہ پوز مشکل ہے۔ ستوتی اس روز راضی ہو جاتی تو شاید یہ اب تک ختم ہو چکی ہوتی۔"

یہ معمہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ بہر حال میں خاموش رہا کیونکہ جاؔن اب خود ہی بول رہا تھا اور میں اپنے کسی غلط سوال سے اس کے خیالات کا رُخ موڑنا نہیں چاہتا تھا۔

"ڈاکٹر باہر سے آئے ہو۔ کافی کی طلب ہو گی ہی۔ ذرا اس الماری میں سے سامان نکال لو اور کافی بنا کر پی لو۔ معاف کرنا میں تو اُٹھ نہیں سکتا۔ ہاں ایک پیالی مجھے بھی دے دینا۔"

میں نے گیس جلا کر کیتلی میں پانی رکھا۔ پیالیوں میں کھانڈ، کافی اور دودھ ڈالنے

تک پانی اُبلنے لگا۔ میں نے کافی بنا کر ایک پیالی اسے دی اور دوسری خود پینے لگا۔ پیالی میں سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو دیکھتے ہوئے میں کافی کو کوس رہا تھا جس کی وجہ سے موضوع اپنی لائن سے ہٹ گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب دوبارہ بات کو کیسے اس طرف لایا جائے لیکن ماحول نے میری مدد کی۔ نیم تاریک کمرے میں کافی کا گرم پیالہ ہونٹوں سے لگے تو خواہ مخواہ دماغ میں یادیں مچلنے لگتی ہیں، چنانچہ جان خود بول اُٹھا۔

"ڈاکٹر! ایلن سے ملے مجھے چالیس برس ہو گئے ہیں۔ اس عرصہ کا بہت سا حصہ میں نے ہندوستان میں گذارا ہے کیونکہ میں انگلینڈ سے دور رہنا چاہتا تھا۔ دو برس ہوئے مجھے پتہ چلا کہ ایلن یہاں ہے اور میں نے سوچا کہ اب بطور آرٹسٹ کے جا کر اُسے ملوں گا اور اپنی گزشتہ محبت کے متعلق تین تصویریں بنا کر لے جاؤں گا۔ اس دن سے میں اسکول میں کام سیکھ رہا ہوں۔"

"لیکن اس سے ملنے کے لئے تم تصویریں کیوں بنانا چاہتے ہو؟"

جان نے گردن اُٹھا کر لمبا گھونٹ لیا۔ کافی ختم کر کے پیالی اسٹول پر رکھی اور بستر میں لیٹتے ہوئے بولا۔ "ڈیوڈ آرٹسٹ تھا ڈاکٹر . . . بہت عمدہ آرٹسٹ . . . اب تو بے چارہ مر چکا ہے۔" وہ کچھ سوچنے لگا۔ میں کافی کی چسکیاں لیتا رہا۔

"میری ایلن سے ٹوٹنے کی وجہ بھی یہی تھی۔ کیپری کے جزیرے سے واپسی پر لندن میں جب وہ ڈیوڈ سے ملی تو اس کے رنگوں کی قوس میں پھنس گئی اور مجھ سے کئے ہوئے سب وعدے بھول گئی . . . وہ کہتی تھی کہ آرٹسٹ کی شخصیت ایک ایسا وسیع جہانِ رنگ و بو ہے جس میں خلوص کی ہوائیں چلتی ہیں اور سچے جذبات کی برکھا ہوتی ہے۔ وہ اتنا وسیع القلب ہوتا ہے کہ اس میں ساری انسانیت سما سکتی ہے اور میں . . . . میں آرٹسٹ نہ تھا۔"

جان پھر سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "میں تصویریں بنا کر اس کے پاس لے جاؤں گا۔ جو خالص میرے ہاتھ سے بنی ہیں —— خالص میری —— ان میں مس ٹیلر کا مشورہ بھی شامل نہیں، پھر ایلن کو پتہ چلے گا کہ میں بھی آرٹسٹ بن سکتا ہوں۔" وہ نڈھال سا ہو کر بستر میں گر پڑا۔

"جان! کافی اور پیوگے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے اس سے پوچھے بغیر ایک سگریٹ سلگا کر اسے دے دیا۔

"جان ایک بات بتاؤ۔" میں نے ایش ٹرے میں راکھ جھاڑی "اگر اب تم ڈرائنگ سیکھ سکتے ہو تو اس وقت تم نے کیوں نہ سیکھی جب اس کا کوئی فائدہ بھی ہو سکتا تھا؟"

جان کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر بولا "تمھاری عمر کیا ہے ڈاکٹر؟"

"چھبیس ۲۶ سال۔" میں ایسی اچانک انکوائری پر حیران ہو گیا۔

میری عمر ساٹھ ۶۰ سال ہے . . . سمجھے؟ دو ماہ اوپر ساٹھ ۶۰ برس . . . تم سے ڈگنی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ . . . اور یہ سب ایک ایک لمحہ جوڑ کر بنی ہے۔ کبھی تم نے سوچا ہے ڈاکٹر لمحے کی کتنی زیادہ اہمیت ہے۔؟ ہر لمحہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اور ہر لمحے میں ہمارا طرزِ عمل ہماری اس وقت کی مخصوص ذہنی کیفیت کے مطابق ہوتا ہے اس لئے بعض لمحے چھوٹے ہوتے ہوئے بھی اتنے بڑے ہو جاتے ہیں کہ ان کے سائے ہماری ساری زندگی کو تاریک کر دیتے ہیں . . . لیکن تم تو بہت چھوٹے ہو، تم اسے کیا سمجھو گے؟"

اور میں واقعی کچھ نہ سمجھ سکا۔ اگلی بات کے انتظار میں خاموش بیٹھا رہا۔

"میں ان لمحوں میں پیورٹن (Puritan) تھا ڈاکٹر۔ میں پیورٹن گھرانے میں پیدا ہوا اس لئے تصویر کشی کو گناہ سمجھتا تھا۔ میں بڑا پکا مذہبی آدمی تھا جیسے کہ آج کل تم ہو۔ میں نے اکثر تمھیں کمرے میں نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ مجھے پتہ ہے تم شراب بھی نہیں پیتے۔ اسی طرح میں بھی پورا مذہبی تھا اور ہر قسم کے آرٹ کو گناہ سمجھتا تھا۔ اس وقت میری سوچ اپنی نہ تھی بلکہ دھرم سے گھڑی ہوئی تھی۔ وہ لمحے میرے نہ تھے ان پادریوں کے تھے جو خدا کے نام پر خدا کی مخلوق کو اپنے تابع رکھتے ہیں۔ میں نے ایلن سے کئی بار کہا کہ میں بھی چاہوں تو آرٹسٹ بن سکتا ہوں لیکن میں تمھارے لئے دنیا چھوڑ سکتا ہوں دین نہیں۔ مگر وہ کہنے لگی ڈینگ نہ مارو جان! مذہب کی پابندیوں کا کچلا ہوا ادھ موا آدمی کبھی اس قابل نہیں ہو سکتا کہ آرٹسٹ کی سی ہمہ گیر شخصیت پیدا کر سکے۔ اس نے بالکل اسی انداز میں یہ کہا تھا جس طرح اس رات سوتی نے مجھے غلیظ اور بوڑھا پکارا تھا . . ."

جان خاموش ہو گیا۔ میں بھی چپ تھا۔ کھنچے ہوئے پردوں کی درزمیں سے شیشے پر پانی کے قطرے باری باری جھانک کر کمرے کی مسحور فضا دیکھ رہے تھے۔ ایک دم دھاکہ سا ہوا اور گیس کا ہیٹر بجھ گیا۔ جان نے میز سے مجھے شلنگ اٹھا کر دیا۔ میں نے مشین میں

میں ڈالا اور گیس پھر سے جلنی شروع ہو گئی۔ جاؔن میری طرف غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"میں جانتا ہوں تمھارے من میں کیا ہے ڈاکٹر۔ تم یہی پوچھنا چاہتے ہو ناکہ میں اب کیوں تصویر بناتا ہوں۔ بات سیدھی سی ہے۔ یہ چالیس سال بعد کے لمحے ہیں اور ان موجودہ لمحوں کے پیچھے کروڑوں لمحوں کی اخذ کردہ عقل ہے جو میں نے امیدوں، اُمنگوں، خوشیوں، غموں، مایوسیوں اور مصیبتوں کی گودمیں سے چُنی ہے اور اس عقل نے مجھے سکھایا ہے کہ دھرم پابندیوں کا نام نہیں، یہ تو بندے اور خدا کے درمیان گیان اور دھیان کا ایک ذاتی رشتہ ہے جو جیسے چاہے استوار کرے . . . . فرد کی ذات دھرم کے بغیر نامکمل ہے میرے بیٹے۔ اس کے بغیر اسے سکون نہیں مل سکتا۔ لیکن جب مذہب اپنی منفی قدروں کے ——————— (Concentration Camp) میں جماعتی نظام ٹھونستا ہے تو پابندیوں سے فرد مر جاتا ہے، اس کے اندر کا انسان مر جاتا ہے اور حق ہو کہنے والے کٹھ پتلے رہ جاتے ہیں جو باٹا کے بوٹوں کی طرح ایک ہی سانچے پر کروڑوں کی تعداد میں بنے ہیں . . . . ذرا ایک پیالی کافی کی اور بنانا . . . . ایک ہی انسان کی زندگی کا ہر لمحہ دوسرے سب لمحوں سے مختلف ہے اور مذہب کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ ان تمام لمحوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ نہ صرف ایک آدمی کی زندگی کے تمام لمحے بلکہ تمام لمحوں کا ایک ہی معیار بناتا ہے۔ یہ انسان کو فرشتہ بنانے کی کوشش میں نہ تو انسان ہی رہنے دیتا ہے اور نہ فرشتہ بنا سکتا ہے۔"

"جاؔن تم جذباتی ہو رہے ہو، فی الحال اس موضوع کو چھوڑ دو۔ جب تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو کبھی بیٹھ کر بات کریں گے۔" میں نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔

اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ "ڈاکٹر تم تو مذہبی آدمی ہو بھلا بتاؤ گے مذہب پابندیاں کیوں لگاتا ہے ؟"

"نفس کو کچلنے کے لئے۔"

"نفس تو تمام انسانوں کا ایک ہی جیسا ہے لیکن ہر مذہب کی پابندیوں میں کیوں فرق ہے ؟ تم مسلمان سور نہیں کھاتے۔ نہیں کھاتے نا ؟ لیکن ہم عیسائی کھاتے ہیں۔"

وہ میری طرف جواب طلب نظروں سے گھورنے لگا۔

"تمھارے مذہب میں گانا بجانا حرام ہے نا ؟ لیکن عیسائی اور ہندو میوزک سے

بیٹھے گی تو تم کب تک ٹھیک ہو جاؤ گے ؟ "

وہ ایک دم کمبل پھینک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میں تو بالکل ٹھیک ہوں، ابھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں"۔

"ابھی تم آرام کرو جانؔ۔ آج تو سوؔنی بھی جا چکی ہو گی۔ کل شام جب تم آؤ تو اس کی تصویر بنانے کو تیار رہنا۔"

جانؔ بالکل بچوں کی طرح میرے ساتھ لپٹ گیا۔ میں نے اسے احتیاط سے لٹا کر کمبل اوپر ڈال دیا اور خود مڑ کر دیکھے بغیر کمرے سے نکل آیا۔ اس امید کے بعد اس کا اکیلا رہ جانا ہی اس کے لئے مفید تھا۔

اگلے روز میں نے نماز کے بعد دعا مانگی کہ خدا مجھے اس کوشش میں کامیاب کرے اور ذرا جلدی اسکول چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر ادھر اُدھر گھوم کر سوؔنی کو ڈھونڈنے لگا۔ وہ کینٹین میں تھی اور کاؤنٹر سے ٹیک لگائے کوکا کولا پی رہی تھی۔ ارد گرد اور لڑکے لڑکیاں کھڑے تھے میں نے بھی جا کر ایک وائٹ کالی مانگی اور سوؔنی کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا۔

"ہلو ڈاکٹر!" بھلا خوب صورت لڑکیاں نظر انداز ہونا گوارا کر سکتی ہیں۔

"ہلو سوؔنی! یہ نیا لباس مبارک ہو۔"

"نیا کہاں! یہ تو پرانا ہی ہے۔"

"ارے میں تو سمجھا نیا ہے کیونکہ تم اس میں بہت اسمارٹ نظر آ رہی ہو"۔ رکھائی کے بعد تعریف نے دُگنا اثر کیا اور وہ کھِل گئی۔

"تھینک یو ڈاکٹر۔۔۔ کیا میں واقعی خوب صورت لگ رہی ہوں۔"

"اتنی خوب صورت۔۔۔۔ اتنی خوب صورت۔۔۔۔ کہ جانؔ اگر تمھیں دیکھ لے تو پھر سے تصویر بنانے پر آمادہ ہو جائے۔" گرد والے سب لوگ ہنس پڑے

"اس کا ذکر نہ کرو میرے سامنے ۔۔۔ غلیظ بوڑھا!" سوؔنی پھر سے کوکا کولا کی بوتل پر جھک گئی جیسے موضوع ختم کر چکی ہو۔

"ویسے سوؔنی میری رائے میں اُس روز تصویر بنوا لینی چاہئے تھی۔"

"ناآ آ ممکن۔۔۔۔ جانؔ اگر یسوع مسیح سے بھی سفارشی چٹھی لے آئے تو میں اپنی تصویر نہیں بنواؤں گی"۔ اس نے سر کے بال حقارت سے جھٹک دئے اور سگریٹ ہونٹوں میں لے لیا۔

عبادت کرتے ہیں۔ جس مسلمان نے ساری عمر نہیں گایا وہ جنت میں جائے گا اور جس عیسائی نے خوب گا گا کر عبادت کی ہے وہ بھی جنت میں جائے گا۔ نہ معلوم وہاں کس کی مانی جائے گی۔ جنت میں تو پھر سے صلیبی جنگیں شروع ہو جائیں گی۔"

"جان چھوڑو اس بات کو..." میری یہ کوشش بھی ناکام ہوئی۔

"اچھا یہ بتاؤ... بے صبرے نہ ہو... آگ کم کیا دو گے تو آنچ لگے گی ہی... ابھی سے بور ہو گئے کیا؟ یہ بتاؤ مذہب کا بنیادی مقصد تو طبیعت کو سکون ہی دینا ہے نا؟"

میں نے اس بات میں سر ہلایا۔

"تو پھر مذہب کیوں ہر اس چیز پر پابندی لگاتا ہے جس سے طبیعت کو سکون پہنچتا ہے۔ آرٹ، میوزک، ڈانسنگ، ڈرامہ ان چیزوں سے زندگی میں نکھار آتا ہے۔ انسان کی انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ فطرت انگڑائیاں لے کر اٹھتی ہے اور ان کا گرمایا ہوا انسان دو عالم کی تسخیر پر کمر باندھ لیتا ہے۔ میں نے مذہب کی ایک ہی پابندی کو مانا تو گزشتہ چالیس برس سے سکون نہیں ملا۔"

"میں نے تو سنا ہے جان کہ تم بہت بہادر سپاہی تھے اور بہت کامیاب افسر تھے اور بغیر سکون کے تم دلجمعی سے کام کیسے کر سکتے تھے۔" میں نے بات کا رُخ موڑنے کی کوشش کی۔

"ہا ہا ہا۔" وہ ہنسنے لگا۔ پلنگ کی ٹیک سے سہارا لگا کر بیٹھ گیا اور ہاتھ کھینچ کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ دو ایک لمحے وہ میری طرف دیکھتا رہا پھر کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"تم کیا سمجھتے ہو میرے بیٹے۔ محبت میں ہارا ہوا آدمی ہر وقت نوحہ کرتا رہتا ہے۔ نہیں بالکل نہیں — وہ دوسروں کی طرح کھاتا پیتا ہے۔ خوشیاں مناتا ہے۔ مذاق سمجھتا ہے۔ اور کرتا ہے۔ زندگی کے تمام اُمور میں حصہ لیتا ہے، بالکل دوسروں کی طرح۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ اس کے قہقہوں میں کھنک ہوتی ہے خوشی نہیں ہوتی۔ اس کی مسکراہٹیں دوسروں کا من موہ لیتی ہیں، اس کے اپنے دل کو بشاش نہیں کر پاتیں۔ اس کا چہرہ ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں ماحول کی خوشیوں کا عکس تو ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے دل میں ان کی جڑ نہیں ہوتی اور جب وہ اکیلا ہوتا ہے تو اسی آئینہ پر ماضی کی ان گھڑیوں کا عکس بار بار گزرتا ہے — بار بار گزرتا ہے جنھوں نے اسے دائمی کرب اور کسک دیا ہے۔ وہ اس عکس سے سکون حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ میری بہادری سکون کا نتیجہ نہ تھی میرے بیٹے بلکہ سکون کی تلاش تھی۔"

"میں اٹھ کھڑا ہوا۔" اگر تم سے یہ وعدہ کروں کہ سونی تمھارے سامنے تصویر کے لئے

"تمھیں اندازہ نہیں سونی۔ تم نے اپنے ساتھ اس روز کتنی دشمنی کی ہے۔"

جواب دینے کی بجائے سونی کندھے جھٹک کر ماچس جلانے لگی۔ میں نے باہر چلنے کی تیاری کرتے ہوئے کہا۔ "جان اس تصویر کو نمائش میں بھجوانا چاہتا تھا۔ اگر وہ ہو جاتا تو اب تک تم یورپ کی گلیمر گرل بن چکی ہوتیں ۔۔۔۔ بہر حال میں تو چلا ۔۔۔۔" میں اسٹول سے اٹھ کھڑا ہوا۔

سونی کی ماچس کا شعلہ جلتا ہی رہ گیا اور اس کا ہاتھ سگریٹ تک نہ پہنچ سکا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

"کون سی نمائش؟ جان نے تو نہیں بتایا۔" سگریٹ نیچے گر پڑا۔

"معلوم نہیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کوئی یونائیٹڈ فلمز والے کر رہے ہیں۔ ممکن ہے تمھیں بھی کسی فلم میں کانٹریکٹ مل جاتا۔" اور میں چل دیا۔

"گڈ گاڈ ڈاکٹر۔ پلیز ٹھہرو جان کدھر ہے؟"

"وہ تو کسی اور ماڈل کی تلاش میں تین دن سے غائب ہے۔ میرا خیال ہے اب تو آخری تاریخ بھی گزرنے والی ہوگی۔"

"اوہ پلیز ڈاکٹر۔ مجھے جان کے پاس لے چلو۔" اس نے میرے ہاتھ پکڑ لیے۔

میں نے باتوں باتوں میں اس کا شوق اور بھڑکایا اور پھر وہ مجھ سے وعدہ کر کے بھاگ گئی۔ کہ تھوڑی دیر میں لال فراک اور کالا مفلر پہن کر آتی ہے۔

کچھ دیر بعد جان آ گیا۔ میں نے اسے ساری بات سمجھائی تو وہ میری طرف غور سے دیکھ کر سر ہلانے لگا۔ "میرے بیٹے تم اتنے کم سن بھی نہیں ہو جتنا میں تمھیں سمجھتا تھا۔" مسکراتے ہوئے اس نے مجھے تھپکی دی۔

تصویر بنانے سے پہلے سونی نے جان کے کاغذوں سے سلوٹیں نکالیں۔ تارپین اور السی کا تیل اس کی پیالیوں میں انڈیلا۔ برش دھوئے اور پھر اصرار کیا کہ جان اپنے ہاتھوں سے اُسے مناسب پوز میں کھڑا کرے۔ چونکہ وہ بال روم ڈانسنگ پوز تھا اس لیے ایک مرد کی بھی ضرورت تھی "سونی تو شاید پیٹر یا لیگزینڈر میں سے کسی کو بلائے گی۔" میں نے دانستہ چوٹ کی کہ شاید وہ مجھے چن لے۔

"ڈیم اٹ۔" وہ بے صبری سے ہاتھ جھٹک کر بولی۔ "کسی گدھے کو بلا لو مجھے تو اپنی تصویر سے غرض ہے۔"

"کتنی خوش قسمت ہے . . . . اس کے لئے کوئی اتنا بے قرار ہے ۔"

وہ پھر سوچ میں ڈوب گئی اور میں آہستہ سے "معاف کرنا مس ٹیلر" کہہ کر اٹھ آیا۔ دروازے سے باہر نکلتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا تو مس ٹیلر تصویر زمین سے اٹھا کر بڑے پیار سے اپنے فراک سے صاف کر رہی تھی۔

دو دن بعد نوروز کی رات تھی۔ میں رات کے سات بجے کے قریب منہ دھو کر کپڑے بدل رہا تھا تاکہ ایک تقریب میں شرکت کر سکوں کہ اتنے میں جان آ گیا۔ چند باتیں موسم کی ہوئیں، پھر میں نے پوچھا۔

"جان اتنی سردی میں کیوں گھوم رہے ہو ؟"

"میں تمھارا کل کا دن اپنے لئے مانگنے آیا ہوں ڈاکٹر۔ مجھے پتہ تھا تم نوروز کے جشن میں جا رہے ہو گے ممکن ہے کل نہ مل سکو، اس لئے تمھارا وعدہ لینے آیا ہوں۔"

"کیوں، خیریت تو ہے ؟"

"میری تصویر ختم ہو گئی ڈاکٹر۔" وہ بچوں کی سی خوشی سے بولا "میں کل ایلن کے پاس جانا چاہتا ہوں، تم بھی چلنا۔ ایک دوست کے ساتھ ہونے سے تقویت رہے گی۔"

"بڑا شکریہ جان! لیکن ایک آدھ روز صبر کر لو، کیا حرج ہے۔" میں نے گھڑی دیکھی۔

"مجھے معلوم ہے تمھیں دیر ہو رہی ہے . . . . اچھا چلو میں بھی سڑک کے کونے تک تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔ راستے میں باتیں ہوں گی۔"

اوورکوٹ کستے ہوئے ہم باہر نکلے۔ فضا تاریک تھی لیکن زمین پہ ہر طرف برف کے پھیلاؤ سے اس تاریکی میں سہانا اجالا تھا۔ کہیں کھڑکی میں سے روشنی باہر جھانکتی تو اس سحر زدہ ماحول کو زخمی کرتی معلوم ہوتی۔ مختلف گھروں سے گانے اور قہقہوں کی دبی دبی آوازیں نکل کر اندھیرے میں بھٹک رہی تھیں۔ کہیں کسی بجلی کے کھمبے کی چھوٹی سی دنیا میں تھوڑی سی روشنی ہوئی تو کرسمس کی سجاوٹ کا کوئی کنارا اندھیرے میں سے نکل کر جھانکتا۔ کوئی کار قریب آتی تو اس کی روشنیوں کے نور بھرے مخلوط میں برف کے گالے پتنگوں کی طرح اڑتے۔ ان کاروں میں زرق برق جوڑے ڈانسنگ ہالوں کی طرف اڑے جاتے تھے۔ جان میرے بازو میں بازو ڈالے چل رہا تھا۔ کچھ دیر خاموش چلتا گیا، پھر بولا۔

"وہ بھی ایسی ہی رات تھی ڈاکٹر۔ بالکل ایسی۔ نوروز کے جشن والے ڈانس میں ایلن نے

اور میں نے فوراً ارادہ بدل دیا۔ اتنے میں پیٹر ادھر سے گزرا اور ہم نے اسے جھٹ سے جکڑ لیا۔ وہ بھی آمناً و صدقناً کہتا آ گیا۔

جان نے بڑی محنت سے ایک علیحدہ کاغذ پر تصویر بنائی۔ سارا وقت سونی ایسے کھڑی رہی جیسے ٹیلی ویژن پر ہزاروں لوگ اسے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے کچھ کام تھا اس لئے جلد ہی وہاں سے آ گیا کیونکہ جان کا خیال تھا کہ وہ ایک روز میں اصل تصویر پر منتقل کر سکے گا۔

اگلے روز اپنے کمرے میں جانے سے پہلے میں نے آرٹ سیکشن میں جھانکا لیکن جان ابھی آیا نہ تھا البتہ مس ٹیلر اس کی سیٹ پر کھڑی جان کی چیزیں بے زاری سے اِدھر اُدھر پھینک رہی تھی اور ساتھ ہی بڑبڑا رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا اس کے پاس گیا۔

"آج بڑی برہم ہو مس ٹیلر۔"

"او، ہیلو ڈاکٹر۔ . . جب تک یہ کمبخت بوڑھا میرے سیکشن میں ہے میں برہم ہونے کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرا برش اسی نے لیا ہے۔ اس کے اتنے نرم بال ہیں کہ نہایت لطیف قسم کی ڈرائنگ اس سے ہو سکتی ہے۔ میرے پاس وہ پچھلے بارہ برس سے ہے اور میں نے آج تک کسی کو نہیں دیا۔ میرے دوست بھی اُس کی وجہ سے مجھ سے ناراض ہو گئے۔ . . اور جان کے علاوہ کسی میں ہمت نہیں کہ وہ اسے ہاتھ لگا سکے۔" وہ جان کی چیزیں اُٹھا اُٹھا کر فرش پر گراتی رہی۔

"بائی گاڈ۔ . . اگر اس کے غلیظ ہاتھوں نے استعمال کر لیا ہے تو مجھے توڑنا پڑے گا۔"

اتنے میں نیچے سے سونی والی تصویر برآمد ہوئی۔ ڈرار خالی ہو چکا تھا۔ برش وہاں نہیں تھا۔ مس ٹیلر نے برش کا غصہ تصویر پر اُتارا۔ تیوری چڑھا کر اسے دیکھا اور "ہونہہ" کہہ کر زمین پر پھینک دیا جہاں پہلے ہی چاک کے رنگوں کا برادہ بکھرا پڑا تھا۔

یہ دیکھ کر مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور اسے آرام سے سمجھانا شروع کیا۔ اسی سلسلہ میں اسے جان کی ساری کہانی سُنائی۔ اس کے ڈرائنگ سیکھنے کی اور بدمزاجی کی وجہ بتائی۔ مس ٹیلر نے پہلے میری بات کو لاپرواہی سے، پھر دلچسپی سے اور آخر میں نہایت سنجیدگی سے سُنا اور جب میں نے کہانی ختم کی تو وہ گہری سوچ میں بیٹھی رہ گئی۔ اس کی آنکھیں فرش کو دیکھ رہی تھیں لیکن ان میں نظر نہ تھی۔ میں خاموش ہو گیا۔ پھر اس کے لب آہستگی سے کھُلے اور وہ جیسے اپنے آپ سے کہنے لگی۔

زندگی کا پارٹنر بدل لیا تھا اور جب ۱۹۲۰ء کا پہلا سورج چڑھا تو میری دنیا بدل گئی۔ کل ۱۹۶۰ء شروع ہوگا۔ پورے چالیس برس سے ہر روز میری شکست کی سالگرہ ہوتی ہے۔ اگلے سال تک معلوم نہیں زندہ رہوں نہ رہوں اس لئے کل اسے تصویر دینا چاہتا ہوں تاکہ کم از کم ایک نوروز تو فتح کا بھی دیکھ لوں۔ تمھاری زندگی میں کئی نئے سال طلوع ہوں گے بیٹے! کل کا دن مجھے دے دو۔ صرف ایک دن۔"

میں ضرور چلوں گا جان۔" میں نے غیر ارادی طور پر اسے قریب کرکے بھینچ لیا اور پھر ایک بڑا جدّت والا خیال میرے ذہن میں کوندے کی طرح لپکا۔

"سنو جان! کیوں نہ کل کے روز کو مکمّل فتح منایا جائے۔ اگر اس پر تصویر دوں کا اچھا اثر ہو تو۔۔۔ تو تم اس سے شادی کر لو۔"

جان چپ ہو گیا جیسے اسے یہ بات پسند نہیں آئی۔ کافی قدم چل کر بولا۔

"شادی؟۔۔۔ ہونہہ۔۔۔ شادی!" اس کی مری ہوئی آواز بھی طنز سے بھرپور تھی۔ میں سمجھا شاید اپنے اور ایلین کے بڑھاپے کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

"ہاں ہاں۔ کیا حرج ہے۔ ساری عمر تمھیں جس چیز کے نہ ہونے سے سکون نہیں ملا اگر اب مل جائے تو اس سے بڑی خوشی کیا ہو سکتی ہے۔" جان خاموشی سے چلتا گیا۔ میں نے انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ کر ردعمل معلوم کرنا چاہا تو اس کے منہ سے سانس بھاپ بن کر چہرے کے تاثرات کو چھپا رہا تھا۔ جان کافی دیر سوچتا رہا۔

"نہیں! میں شادی ہرگز نہ کروں گا۔"

"کیوں؟" میں جھلا گیا "جان تم تو بس بچے بن جاتے ہو بعض دفعہ۔"

"نہیں میرے بیٹے۔ نہیں۔۔۔ جانتے ہو کیوں؟ جب میں نے آخری دفعہ ایلین کو دیکھا تھا تو وہ اٹھارہ سال کی حسین لڑکی تھی جو سرخ فراک اور کالے مفلر میں قلانچیں بھرتی تھی۔ اس وقت سے آج تک وہ اسی طرح میرے ساتھ رہی ہے۔ اس نے مجھے لوریاں دے کر سلایا ہے اور بوسے دے کر جگایا ہے۔ ہندوستان کے جنگلوں میں اس نے میرا ساتھ دیا ہے۔ انگلستان کی سردیوں میں اس نے مجھے گرم رکھا ہے۔ امپھل کے مورچے میں زخمی ہوا تو اس نے میری تیمارداری کی، میری آنکھ کے گھاؤ کو اس نے اپنی نرم انگلیوں سے سینچا ہے۔ اب میں ساٹھ برس کا ہوں لیکن وہ اسی طرح اٹھارہ سالہ حسین لڑکی میری

انگلی پکڑ کر مجھے چلاتی ہے۔ وہ اب بھی میرے ساتھ ہے۔ تم تو نوروز کے جشن میں چلے جاؤ گے اور میں کسی پارک میں بیٹھ کر اس سے باتیں کروں گا۔ میٹھی میٹھی، سکون دینے والی۔ اور برف ہم پر گرتی رہے گی... اب اگر میں اس ایلین سے شادی کر لوں تو یہ ایلین کدھر جائے گی۔ نہیں بیٹے نہیں۔"

وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگنے لگا لیکن میں نے پکڑ لیا...

"سُنو جان! اگر یہ بات ہے تو پھر تم نے دو سال سے یہ کیا سوانگ رچا رکھا ہے... بڑھاپے میں گھر بیٹھ کر آرام کرتے۔ یہ دن رات ایک کر کے تصویریں بنانے میں کیا تُک تھی؟"

"کیا.. تُک... ہے؟؟... یہ تو.... مجھے بھی معلوم نہیں۔"

"عجیب بات ہے۔" مجھے سچ مچ غصہ آگیا۔ "تو پھر تم چاہتے کیا ہو؟"

"میں کیا چاہتا ہوں؟؟" جان نے منہ اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھ سے پانی بُری طرح رِس رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس نے دستانہ اُتارا اور کانپتی ہوئی انگلی سے آنکھ خشک کی۔ پھر دستانہ پہنتے ہوئے بولا۔ "میں کیا چاہتا ہوں... شاید کچھ... ہاں!... بس میں اتنا چاہتا ہوں کہ... کہ... ایلین پچھتائے... لمحہ بھر کو پچھتائے...." وہ جیب میں سے رومال ڈھونڈنے لگا " اگر وہ ایک لمحہ کے لئے پچھتاتی ہے تو... بس... میرا چالیس سالہ کرب ڈھل جائے گا... ایک لمحہ...."

اب اس کی دونوں آنکھوں سے پانی رِس رہا تھا۔ پانی؟؟ اپنی جیب سے رومال نکال کر اسے دیتے ہوئے میں نے کہا۔ "جان میں کل تمھارے ساتھ چلوں گا۔"

اگلے روز صبح ہی صبح جان آگیا۔ وہ تصویریں اُٹھائے تھا۔ میں نے نئے سال کی مبارک باد دی اور پوچھا۔ "جان تمھاری تصویر تو اچھی بن گئی ہے نا؟"

"اچھی کیسے نہ بنتی۔ بہترین برش سے بنائی ہے؟"

"کیا مطلب؟" میرا دماغ تین روز پہلے والے واقعہ کی طرف چلا گیا۔

"یہ مِس ٹیلر ہے نا۔ یہ بھی ایک عجیب عورت ہے۔ پرسوں میں تصویریں بنانے لگا تو کہنے لگی، جان اپنے برش سے نہ بناؤ رنگ خراب ہو جائے گا اور پھر اندر سے اپنا برش اُٹھا لائی۔ تمھیں شاید پتہ نہیں وہ بڑا بہترین برش ہے اور مِس ٹیلر اسے کسی کو نہیں دیتی بلکہ اگر کوئی مانگے تو لڑتی ہے۔ لیکن مجھے خود ہی لا دیا اور جب تک میں تصویر بناتا رہا اپنے سارے کام چھوڑ کر وہیں کھڑی رہی اور خاموشی سے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ میں نے کہا مِس ٹیلر

بیٹھ جاؤ تو بولی بھی نہیں۔ بس دیکھتی رہی اور پھر اس روز کوئی مشورہ بھی نہیں دیا، کوئی تصحیح بھی نہیں کی حالانکہ پہلے اپنے آپ کو بہتر آرٹسٹ بتانے کے لئے وجہ بے وجہ غلطیاں نکالتی تھی۔ میں تصویر بنا چکا تو خاموشی سے برش اٹھا کر لے گئی۔"

تیار ہو کر میں نے ٹیکسی کے لئے فون کیا۔ باہر نکلتے نکلتے ٹیکسی تیار تھی اور ہم بوڑھوں کے ہوسٹل پہنچ گئے۔

انگلینڈ میں اولڈ پیپلز ہوم دیکھ کر مجھے ہمیشہ وحشت ہوتی تھی جہاں تیس چالیس بوڑھے بیکار بیٹھے موت کا انتظار کرتے رہتے ہیں جیسے آخرت کے سفر سے پہلے اسٹیشن پر ویٹنگ روم میں بیٹھے ہوں۔ ان کا یہاں آنا گویا اس چیز کا اعلان ہوتا ہے کہ تم دنیا سے فالتو ہو گئے ہو۔ کبھی کبھار ان کے عزیز و اقارب آ کر دیکھ جاتے ہیں کہ ابھی مرنے میں کتنی کسر باقی ہے۔ جس بوڑھے سے بات کرو یاس اور مایوسی میں ڈوبی ہوئی یادوں کا ذکر کرے گا اسی لئے میں نے جان سے کہا کہ میں زیادہ دیر نہیں ٹھہروں گا کیونکہ مجھ سے موت کا زندہ روپ نہیں دیکھا جاتا۔ اسے ایلین کے پاس چھوڑ کر میں چلا جاؤں گا۔ جان اس وقت سخت بے چین تھا بحث یا ضد کرنا اس کے بس کا روگ نہ تھا اس لئے فوراً راضی ہو گیا۔

جب دروازے میں داخل ہونے لگے تو اس نے تصویریں مجھے دے دیں کیونکہ وہ تشویش سے بری طرح کانپ رہا تھا۔ اندر جانے سے پہلے وہ رک گیا۔ "مسلسل دو سال سے اس لمحے کا انتظار کرتا رہا ہوں ڈاکٹر۔ رک جاؤ ذرا۔ مجھے اپنے اوپر قابو پا لینے دو۔"

"فرمائیے۔" ایک ملازم ڈیوڑھی میں مل گیا

"مسز ڈیوڈ ڈیلیز۔"

ملازم نے چونک سے سر ہلایا اور ہمیں ساتھ لے کر اوپر چڑھنے لگا۔ پہلی منزل پر لاؤنج تھا جہاں دس پندرہ بوڑھے مرد اور عورتیں مٹی کے بے جان بتوں کی طرح بیٹھے ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے۔ ایک بوڑھی عورت لفٹ میں سے نکل رہی تھی۔ آہٹ سن کر کھڑی ہو گئی۔ جب تک نظر اٹھا سکتی ہم آگے نکل گئے تھے۔ دو منزل اوپر چڑھ کر کوریڈور میں سے گزرے تو ادھ کھلے دروازوں سے کمروں میں بیٹھے بوڑھے نظر آئے۔ جامد و ساکت بے نور آنکھیں کسی نامعلوم نقطے پر جمی ہوئی۔ ڈھلکے ہوئے پپوٹے لٹکتی ہوئی جھریاں۔ سارے ماحول پر ایک عجیب سی گھٹن چھائی ہوئی۔ مجھے ان کے چہروں پر بالکل وہی آثار نظر آئے جو عید قرباں سے پہلے

منڈی میں بکروں کے چہروں پہ ہوتے ہیں۔ ملازم نے ایک دروازہ کھٹکھٹایا، کھولا اور ہمارے اندر جانے کو راستہ چھوڑ دیا۔

ہم نے کمرے میں جھانکا۔ وہ دوسرے دروازے کے باہر بالکونی میں بیٹھی تھی۔ خلاف توقع اسی روز تین دن کی برف باری کے بعد تھوڑی تھوڑی اندھی دھوپ نکلی تھی۔ انگلستان کے سردی زدہ لوگ دھوپ کی ایک کرن بھی ضائع کرنا کفران نعمت سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ کمبل میں لپٹی ہوئی آرام کرسی پہ نیم دراز تھی۔ ہماری طرف اس کی پُشت تھی اور کرسی کی ٹیک پر سفید بالوں کا گچھا نظر آرہا تھا۔ اس کے سامنے میز تھی۔ جان نے بے چینی چھپاتے ہوئے مجھے اشارہ کیا اور میں پروگرام کے مطابق آگے بڑھا۔ جان اس کی پُشت پہ رُک گیا۔

"مارننگ مسز ڈیوڈ۔۔ میں تمھارا ایک پرانا دوست تم سے ملانے لایا ہوں۔" وہ بوڑھا چہرہ اُٹھاکر میری طرف دیکھنے لگی۔ سفید چہرہ سفید بال اور سفیدی والی آنکھیں۔

"شاید تمھیں جان یاد ہے ابھی تک۔۔۔۔ جان کیلارڈ؟"

اس کے ہونٹ پھیلے۔ چہرے کی ساری جھریوں نے اپنی جگہ بدل کر نیا نمونہ بنادیا۔ وہ مُسکرا رہی تھی۔ "اوہ جونی۔۔۔۔ کہاں ہے وہ؟" میں نے چھچھلتی نظر سے دیکھا۔ جان میں کچھ حوصلہ آگیا تھا۔

"اس نے اپنے ہاتھ سے بناکر یہ نئے سال کا تحفہ تمھیں دیا ہے۔ تم یہ دیکھو۔۔۔ وہ ابھی آتا ہے۔" میں نے شرارت سے جان کی طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھ کر تصویریں ایلن کے سامنے میز پہ رکھ دیں۔ جان کا رنگ لال تھا، ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ چہرے کی جھریاں بے چینی سے مچل رہی تھیں اور وہ اس کا ردِ عمل دیکھنے کو بڑے انہماک سے آگے کو جھکا ہوا تھا۔

وہ اسی طرح مُسکراکر دیکھتی رہی جدھر میں پہلے کھڑا تھا اور کہنے لگی۔ "ہاں جونی۔۔۔ جونی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" اس نے یاد میں غرق ہونے کی وجہ سے مجھے تصویریں رکھتے نہیں دیکھا تھا اس لئے میں نے برف کے منظر کی تصویر اُٹھاکر اس کے چہرے کے سامنے کردی۔

وہ اسی طرح مسکراتی رہی۔

"اوہ! ایلن"، جان چلایا، "کیا تم دیکھ نہیں سکتیں؟"

"تم آگئے جان۔" اس نے ادھر اُدھر سر گھماتے ہوئے کہا۔ "دیکھوں کیا۔ چار سال سے تو اندھی ہوچکی ہوں۔۔۔ کدھر ہو تم۔۔۔۔؟"

تصویر میرے ہاتھ سے گر پڑی میں نے جاآن کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی، بے چینی، غصّہ اور ناکامی گھونسے مار رہے تھے۔ لمحہ بھر میں وہ پسینہ سے شرابور ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی تسلّی کے لئے کیا کہوں۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ جھپٹا اور اگلے لمحے بالکونی سے نیچے کود گیا۔

سانس روک کر میں نے نیچے جھانکا۔ تین منزل نیچے جہاں نشیب کی وجہ سے سڑک اور بھی گہری ہو گئی تھی۔ وہ پتھر کی طرح جاکر گرا اور ایک دفعہ تڑپ کر چت ہو گیا۔ اِدھر اُدھر سے لوگ چیونٹیوں کی طرح لپکے چلے آئے۔

میں نے مڑکر آیئن کی طرف دیکھا۔ وہ ایک ہاتھ فضا میں اُٹھا کر اِدھر اُدھر ہلا رہی تھی۔
"لاؤ اپنا ہاتھ مجھے دو . . . . . کدھر ہو تم . . . . . دیکھو تنگ نہ کرو . . . چالیس سال بعد بھی تمھیں وہ شرارتیں نہیں بھولیں۔

بیٹے کی واپسی

رادھا کرشن کے مندر کے داہنی طرف جو تپلی سی گلی ہے اس میں پہلا مکان کالی چرن کا ہے۔
ہلکے پیلے رنگ کی سفیدی کیا ہوا بڑا سا مکان جس کے لمبے چوڑے برآمدے میں برابر کے فاصلے پر رکھے ہوئے پھولوں کے گملے میں موسم کی مناسبت سے ایک ہی رنگ کے پھولوں کے پودے لگے ہیں۔ اس گھر میں کسی نے بچّوں کو شور مچاتے نہیں دیکھا۔ گلی، محلّے کے کسی شخص کو اس مکان کے مالک کے پاس بیٹھ کر ہنستے بولتے کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ اس گھر کے اندر رہنے والی عورت کو پڑوسنوں کے ساتھ مل کر دوسری بہو بیٹیوں پر طنز کرتے نہ دیکھا ہوگا۔ وہاں جیسے ہر چیز کسی نہ کسی بندھن میں گرفتار ہے۔ مری مری، دبی دبی، دھیمی دھیمی آوازیں، سپاہیوں کی طرح اپنے اپنے کام پر تعینات لوگ۔

لیکن آج اس گھر میں خوشی کی انوکھی لہر کی وجہ سے سب کچھ تبدیل ہو گیا ہے۔
کالی چرن بچّوں کی طرح مسکراتے ہوئے گیندے اور آم کی پتّیاں توڑ رہے ہیں۔ برآمدے میں ڈھیر لگ گیا ہے مگر ان کی طبیعت نہیں بھری۔ انورادھا صبح سے ہی باورچی خانے میں میٹھی لڈّو، مٹریاں، سیب اور گری کی برفیاں بنا بنا کر الگ الگ ڈبوّں میں رکھ رہی ہے۔ آج ان چیزوں کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ کلیانی سارے گھر میں چہکتی پھر رہی ہے۔ بڑی خوشی ہے اسے، آخر بھیّا جو لوٹ رہے ہیں۔ منّے کے لئے کھلونوں کا انتظام کرنا ہے، بھابھی کے لئے کمرہ سجانا ہے اور بھیّا کے لئے البم ٹھیک کر کے رکھنا ہے۔ اتنے کام کاج کے درمیان ماں کا دِکاس اور اموَل کو کھانا لگانے کے لئے

پکارنا اسے بالکل اچھا نہ لگا۔ جلدی جلدی تھالی میں کھچڑی نکال کر چٹنی، پاپڑ اور دہی کی پلیٹ دو چھوٹی چوکیوں پر رکھ دی اور اپنے کمرے میں جا کر کپڑے کی گڑیا کی آنکھیں بنانے لگی۔

"پانی!" وکاس نے چلا کر کہا۔

"چینی!" امول نے چمچہ آگے بڑھا کر اپنی مانگ پر زور دیا۔

"کلّو! پہلے میرے لئے ——" اچانک باپ کو کمرے میں آتے دیکھ کر دونوں لڑکے سہم کر بیٹھ گئے۔ امول نے اپنے بھلے کو پھر سے خوب صورت روپ دے کر کہا ——

"کلیانی دیدی تھوڑی چینی دہی میں ڈال دیجیے۔"

کالی چرن اپنی چوکی پر بیٹھ گئے۔ ان کے داہنی طرف منجھلے لڑکے وکاس کی جگہ تھی اور بائیں طرف چھوٹے لڑکے امول کی۔ ان دونوں کو جگہ بدلتے دیکھ کر انھوں نے ٹوکا۔

"یہ کیا تماشا ہے۔ ٹھیک سے اپنی جگہ بیٹھو۔"

امول نے باپ کی نظر بچا کر وکاس کو ٹھینگا دکھا دیا۔ بڑی شان سے اس کے پیڑے پر بیٹھا تھا! اب مزہ آ گیا بچو کو۔

وکاس کے احساس کو چوٹ لگی۔ اُس نے ہچکتے ہوئے بہانہ بنایا۔ "میرے پیر میں سن سنی ہو رہی ہے تھوڑی دیر یہیں بیٹھ کر کھا لوں۔"

کالی چرن کو لگا جیسے دونوں لڑکے اپنے اوپر پیڑا رکھ کر بیٹھے ہوں یا اُلٹی تھالی میں کھانا کھا رہے ہوں۔ دل میں بڑی اُلجھن ہوئی۔ اُٹھ کر دونوں کے کان پکڑ کر ایک ایک طمانچہ لگایا اور اپنی اپنی جگہ بٹھا دیا۔ الوّرا دھا کو یہ بات بُری لگی۔

'کسی دوسرے کا بیٹا سات سال بعد گھر لوٹ رہا ہوتا تو وہ پھولا نہ سماتا، لیکن یہ ہیں کہ صبح سے ہائے ہائے مچائے ہیں۔' اس نے دل ہی دل میں سوچا مگر کچھ کہا نہیں۔ جانتی تھی کہ اگر اس نے ایک لفظ بھی کہا تو سارے گھر کی شامت آ جائے گی اور انوم سے اس کا دو گھڑی باتیں کرنا بھی محال ہو جائے گا۔ اور پھر اُس کی بیوی کیا سوچے گی جو پرائے گھر کی بیٹی کے سامنے عزّت تھوڑے ہی گنوانی ہے۔ اِن کا کیا ہے جب دل میں آتا ہے کہی ان کہی سب کہہ ڈالتے ہیں۔ غصّے میں آ کر بیٹے یا بہو کو دو چار سُنا دی تو دوبارہ اِس گھر میں جھانکے گی نہیں۔

"اب تو الوپم بہت بدل گیا ہوگا؟" اس نے اپنے شوہر کی توجہ ہٹانی چاہی۔
"ہاں تمہیں یاد ہے جب وہ گود میں تھا تو لوگ ہنسی میں کہا کرتے تھے کہ یہ لڑکا اسپتال میں کسی انگریز کے لڑکے سے بدل گیا ہے۔ گورا گلابی رنگ، گھنگھریالے بال، نیلی آنکھیں! جو دیکھتا تھا دیکھتا ہی رہ جاتا۔

ماں کو یاد نہ ہوگا بھلا! اس کی یادداشت کے آنگن میں اس کی ساری تصویریں محفوظ تھیں۔ انھیں کے سہارے تو وہ انتظار کے لمبے لمبے راستے پار کر رہی تھی ہنس کر بولی
"مجھے لگتا ہے چھوٹا منا ٹھیک اسی طرح ہوگا۔ ویسا ہی چنچل، ویسا ہی بھولا، ویسا ہی خوبصورت۔ اچھا ایک بات بتاؤ۔ بہو تو پڑھی لکھی ہی ہوگی۔ تم سے پردہ نہیں کرے گی اور ساتھ ہی بیٹھ کر کھائے گی؟"
کالی چرن نے محبت سے سرشار ہوتے ہوئے کہا "الوپم کی ماں! وہ جو بھی ہے، جیسی بھی ہے۔ اس گھر کی لکشمی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسی کی قسمت سے اپنا بیٹا واپس مل رہا ہو۔ وہ ساتھ بیٹھ کر ہنسے بولے، کھائے پیئے۔ یہ تو خوشی کی بات ہے۔ ہمارے لئے جیسی کلیانی ویسی وہ۔"
"ہاں! وہ تو ہے۔ مجھے تو رہ رہ کر لگتا ہے کہ اسی نے یہاں الوپم سے آنے کے لئے ضد کی ہوگی ورنہ اتنے برسوں میں وہ اپنی خیریت کا ایک پوسٹ کارڈ بھی نہ ڈالتا۔!"
النور ادھا نے اٹھ کر کمر سیدھی کرتے ہوئے کہا "کھانا لاؤں؟"
"نہیں اس وقت نہیں۔ اب تو رات میں الوپم کے ساتھ ہی بیٹھ کر کھاؤں گا۔ ذرا ٹھیک سے جھنڈیاں لگوا دوں اور۔۔۔"
"سب دروازوں پر لگ گئی بابو۔ پھولوں کے دو ہار بھی میں نے بنالئے یہ دیکھئے۔ ایک بھیا کے لئے دوسرا بھابھی کے لئے۔"
"کالی چرن نے ہنستے ہوئے اس کی پیٹھ تھپتھپا دی اور صدر دروازے کی طرف ہاتھ جوڑ کر بولے۔" جیسی تیری مرضی پربھو۔" ان کے کمرے سے جاتے ہی کلیانی نے گڑیا کے اوپر سے رومال ہٹاتے ہوئے کہا۔" دیکھو جی کتنی پیاری بنی ہے۔ لگتا ہے ابھی بول دے گی۔"
"ایک دم کلو پری۔" اتول نے بہن کو چڑھایا۔
وکاس نے اس کے ہاتھ سے گڑیا چھین لی اور اسے دیکھ کر کھلکھلانے لگا۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ چڑھ کر کلیانی نے کہا۔" پاگل ہو گیا ہے کیا؟"

وکاس نے گڑیا آگے بڑھا کر کچھ کہنا چاہا مگر بیچ ہی میں پھر ہنسی آگئی۔ کسی طرح ایک ہاتھ سے پیٹ دبا کر کچھ الفاظ اور کچھ اشاروں سے بتایا "گڑیا کی آنکھ ــ"

باقی جملہ ہنسی میں ڈوب گیا۔ اس بار امول بھی ہنسی میں شامل ہوگیا اور چلّانے لگا۔

"کلّو کی گڑیا کانی! کلّو کی گڑیا کانی! کلّو کی گڑیا...."

کلیانی نے غصّے میں آکر اپنی گڑیا چھین لی اور کھسیا کر کالا تاگا اور سوئی لینے کمرے میں گھس گئی۔ بھتیجے کو کیا وہ کانی گڑیا دیتی۔

کالی چرن اس شور و غُل سے متوجہ ہو کر کمرے تک چلے آئے۔ پردہ اُٹھا کر اندر جھانکا تو دونوں لڑکوں کی ہنسی ہونٹوں پر جم کر رہ گئی۔ اُنھوں نے ایک بار باپ کی طرف نظر اٹھائی اور پھر سر جھکا لیا۔ کالی چرن بچّوں کے مزاج میں تبدیلی دیکھ کر خفیف ہوتے ہوئے بولے "کھیل رہے ہو؟ کھیلو کھیلو! میں یہ دیکھنے چلا آیا تھا کہ کلیانی نے بڑے بھیّا کا کمرہ کیسے سجایا ہے؟ بہت اچھا لگ رہا ہے۔ تم لوگوں نے اس کی کچھ مدد بھی کی؟ بھیّا جو چیزیں لائیں گے اُسے تو برابر سے بانٹ لوگے۔" لڑکے سمجھ نہ سکے کہ ڈانٹ پڑنے کا سلسلہ ہے یا باپ اُنھیں خوش ہونے کا موقع دے رہے ہیں۔ کالی چرن کو جواب کی کوئی امید نہ تھی۔ وہ مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں لوٹ آئے۔

انور ادھا چارپائی پر بیٹھی ہوئی خربوزے کے بیج چھیل رہی تھی۔

"بہو کو منہ دکھائی کیا دوگے؟" انور ادھا نے پوچھا۔

"اپنی زنجیر دے دینا۔ ایک دم نئی رکھی ہے۔ چھ ساڑھے چھ تولے کی ہے۔ ذرا پتہ لگے گا کہ ساس نے کچھ دیا ہے!"

"ہوں! اور تم انگوٹھی دے دینا۔"

"کیوں نہیں اپنے سے کم تو دلواؤ گی جس سے تمہاری خوب عزت کرے اور مجھے کنجوس سمجھے!" پھر اچانک کچھ شرمندہ ہو کر بولے۔ "پتہ نہیں کہاں کی ہے؟ کس ذات کی ہے؟ کیسے گھرانے کی ہے؟ انو کم نے ایسا ناطہ توڑا کہ شادی پر ایک کارڈ بھی نہ ڈالا۔"

"ڈر کے مارے نہیں لکھا ہوگا۔ سوچا ہوگا تم کو لکھے گا تو تم بُرا مانو گے۔ تمہاری جتنی عزت کرتا ہے اتنا ہی ڈرتا بھی تو ہے۔ میں سوچتی ہوں بہو چاہے جیسی بھی ہو۔ بیٹا گھر لوٹا یہی بہت ہے۔ اپنے گھر خوش رہیں گے تو اپنا بھی کلیجہ ٹھنڈا رہے گا۔ تم اس بارے میں انو تم سے کچھ مت کہنا۔"

"نہیں جی! کیا میں پاگل ہوں؟ کبھی تھوڑا بہت غصّہ آتا ہے۔ یہی میری سب سے

بڑی کمزوری ہے۔ لیکن کیا کروں عادت سے مجبور ہوں۔ جان بوجھ کر تو کسی سے کچھ کہتا نہیں۔ تم لوگ اتنا سمجھتے ہوئے بھی بُرا مان جاتے ہو۔ مجھے آج بار بار وہ شام یاد آرہی ہے جب ذراسی بات پر وہ بگڑ کر گھر سے چلا گیا تھا۔ ہم نے کہاں کہاں خط و تار نہ بھیجے۔ اخباروں میں چھپوایا، رشتے ناطے، جان پہچان والوں کے گھر کہلایا مگر میرے بیٹے نے ایسی ضد پکڑی کہ کسی طرح کوئی خبر ہی نہ ہونے دی۔"

انورادھا کا چہرہ بیتے ہوئے غم کی لہر اور آنے والی خوشی سے تمتما اُٹھا۔ کالی چرن کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ صفائی دیتے ہوئے بولے۔ "تمہیں بتاؤ انوپم کی ماں! میں نے ایسا کیا کیا تھا جو وہ مجھ سے اتنا ناراض ہو گیا؟ کہتا تھا کہ میں پلنگ پر بیٹھ کر کتاب پڑھتا ہوا ہی کھانا کھاؤں گا۔ چھی چھی! اَن کی اتنی توہین! اُس پر تو ان دنوں بھوت سوار تھا۔ جو کچھ میں کہتا تھا اس کا ٹھیک اُلٹا ہی کرتا۔ اس بات پر اگر میں نے دو چار باتیں کہہ دیں تو کیا اُسے بُرا ماننا چاہئے تھا؟ آخر میں اس کا باپ ہوں۔ جو کچھ کروں گا اُس کی بھلائی کے لئے ہی کروں گا۔"

"خیر حد تو تم نے بھی کر دی تھی۔ کیا کسر باقی رکھی تھی؟ دن رات بیچارے کے پیچھے پڑے رہتے تھے۔ صاف کہہ دیا تھا کہ اس گھر میں رہنا ہو تو جیسے میں رکھوں ویسے رہو ورنہ نکل جاؤ! اس نے کچھ جواب دیدیا تو تم نے اُسے بیت سے مارا۔ رام رام! اتنے بڑے لڑکے پر کوئی ہاتھ اُٹھاتا ہے؟" انورادھا نے بیٹے کی طرف داری کی۔

"ارے چھوڑو! اپنے ہی بیٹے اس طرح بُرا ماننے لگیں تو ہو چکا بھر۔ ہمارے ماں باپ ذرا سی غلطی پر کھال اُدھیڑ کر رکھ دیتے تھے، مگر کیا مجال جو ہم نے کبھی اُلٹ کر جواب بھی دیا ہو۔"

"وہ زمانہ اور تھا۔ میری ماں سُناتی ہے کہ اُن کی ساس جب کبھی دن میں اُنہیں خالی بیٹھے دیکھتی تو ایک تھالی میں دال اور چاول ملا کر اُنہیں پھر سے الگ کرنے کے لئے تھالی پکڑا دیتی تھی لیکن چھوڑو اس قصّے کو۔"

کالی چرن نے رات کو اسٹیشن جانے کے لئے اپنا سوٹ نکال کر ٹانگ دیا۔ تبھی ایک کونے میں تپائی پر رکھے ایش ٹرے کو دیکھ کر اُنہیں خیال آیا کہ انوپم کے لئے سگریٹ نہیں منگوائی۔ ان نے چھپا کر پیتا تھا تو کیا ہے بیٹے کے عیب اور خوبیاں اُن سے چھپی تھوڑی ہی تھیں۔ پھر آج تو اس کی ساری غلطیاں قابلِ معافی تھیں۔ وہ خود ہی سگریٹ خریدنے چل دیے۔

بیج کی پٹاری کھڑکی پر رکھ کر انورادھا تھوڑی دیر کے لئے لیٹ گئی۔ آنکھیں لگیں تو معلوم ہوا کہ جیسے شکوہ شکایتوں سے بھرا انوپم سامنے آیا۔ ننھا سا تھا تب نیا نیا پڑھنا لکھنا شروع کیا تھا۔ کالی چرن نے بڑے جوش کے ساتھ کاپی پر اس کا نام لکھا۔ برسات کے دن تھے۔ موسلا دھار بارش

ہو رہی تھی۔ گھر کے سامنے کا نالا اوپر تک بھر گیا تھا۔ انوپم نے اپنے ساتھیوں کو اس میں ناؤ چلاتے دیکھا تو دوڑا
ہوا ماں کے پاس آکر بولا "ماں! ماں! کاغذ دے دو، ہم بھی ناؤ بنائیں گے۔"

وہ آٹا گوندھ رہی تھی۔ بولی "ذرا رک جاؤ۔"

لیکن بچوں میں اتنا صبر کہاں! جھٹ سے اپنی کاپی سے چار پنے پھاڑ کر بھاگ گیا۔ دوسری صبح
جب باپ نے استاد کی جگہ سنبھالی تو اس جرم پر مارتے مارتے بیدم کر ڈالا۔ انورادھا سے جب نہ دیکھا
گیا تو وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"کیا دو کاغذ کے ٹکڑوں کے لئے بچے کی جان ہی لے لوگے؟ چھوڑ بھی دو بیچارے کو۔"

لیکن کالی چرن قاعدے قانون والے آدمی تھے۔ وہ طمانچے کے بعد پوچھتے "بول پھر
ایسا کرے گا؟"

معصوم لڑکا اس قدر ڈرا ہوا تھا کہ رونے کے سوا اسے کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ اس واقعہ
کے بعد پورے بیس دن تک وہ بیٹے اور بیوی سے ناراض رہے۔

ایک دن انوپم کو اسکول کا کچھ کام کر کے لیجانا تھا۔ اس کا قلم نہیں مل رہا تھا میز پر کالی چرن
کا قلم رکھا دیکھا تو اس سے لکھنے لگا۔ کام کر چکنے کے بعد اسکول کی جلدی میں وہ بھولے سے قلم اپنے بستے
میں رکھ کر نہانے چلا گیا۔ اسی دوران کالی چرن کو بھی نہانے کی ضرورت پڑی اور گھر میں اس کی
کھوج ہونے لگی۔ انوپم نہا کر نکلا تو گھر کا نقشہ بدلا ہوا پایا۔ باپ نے ڈانٹ کر پوچھا "تو نے میر
قلم اٹھایا ہے؟"

ڈر کے مارے اس نے سر ہلا کر انکار تو کر دیا مگر پھر فکر ہوئی کہ پکڑے جانے پر کیا ہوگا
آخر میں سوچ کر یہ طے کیا کہ دوسرے کمرے میں جاتے ہی قلم کو میز کے اندر ڈال کر وہ کھسک جائے
لیکن اس کی بدقسمتی سے کھانے کا ڈبہ رکھنے کے لئے کلیانی نے بستہ کھولا تو اچانک اس کے منہ سے
نکل گیا۔

"پتاجی! قلم مل گیا!"

پھر تو انوپم کی بری حالت ہو گئی۔ مار تو پڑی ہی۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ سامنے آتا
کالی چرن پوچھتے "کہو بھیا! کیا چرانے کا ارادہ ہے؟ بتا کے لے جانا۔ بڑی تکلیف ہو جاتی ہے"
یا اس کا مذاق اڑاتے "آؤ! آؤ! سب لوگ چور مہاراج کا درشن کرو" لیکن اپنی جیب پہ ہاتھ رکھ

رہنا اس لئے کہ اس بیچ شاید یہ ہُنر بھی انھوں نے سیکھ لیا ہو۔ بیچارے جیل جانے کا پورا انتظام کر رہے ہیں۔ اچھا ہی ہے، کوئی خاندان میں نام تو کرے۔"

انوپم یہ سُن کر تلملا کر رہ جاتا۔ ماں کو خوب کھری کھوٹی سُناتا۔ تب وہ بڑا ہو گیا تھا۔ دسویں درجے میں پڑھتا تھا۔ ششماہی کا نتیجہ کئی دنوں سے اس کی کتابوں میں دبا پڑا تھا۔ آخر اس نے نکال کر ایک دن ماں کو پکڑا دیا۔ تاریخ اور سیاسیات میں فیل تھا باقی مضامین میں بھی خراب نمبر آئے تھے۔ انورادھا نے پریشان ہو کر پوچھا "تو سارا وقت کہاں ضائع کرتا ہے؟ اس طرح پڑھے گا تو کیسے کام چلے گا؟" ماں کی ممتا نے خاموش فطرت لڑکے کو سہارا دیا۔ وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر بولا۔

"ماں! میں کیا کروں؟ کتاب کھولتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ پتاجی دروازے پر کھڑے مجھے گھور رہے ہیں، پتاجی برآمدے میں چلا رہے ہیں۔ پتاجی چھپ کر دیکھ رہے ہیں کہ میں اتنی دیر خالی دیوار کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ ہر وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مجھے ڈانٹنے آئے، بس اب آئے۔ تمھیں دیکھو کل مٹھائی خریدنے میں مجھ کو دیر ہو گئی تو کتّے کی طرح مجھے دھتکار دیا اور تمھیں بھی . . ."

"نہیں بیٹا! ایسا کیوں کہتے ہو؟ وہ تمھارے باپ ہیں، کبھی کسی غلطی پر ڈانٹ دینے کا حق اُن کو نہیں کیا؟"

"غلطی کرنے پر! جیسے سچ مچ وہ اتنا سوچ سمجھ کر بگڑتے ہیں۔ تم تو ان کی طرف سے بولو گی ہی۔ میں پہلے ہی جانتا تھا کہ تم سے دل کی بات کہنے سے اچھا ہے کہ دیواروں سے کہہ دوں۔ تم لوگ مل کر مجھے کچل دینا چاہتے ہو، مٹا دینا چاہتے ہو۔ وہ مجھ سے نفرت کرتے ہیں اور میں تمھیں بھی صاف صاف بتا دوں کہ اس سے بھی کہیں زیادہ نفرت میں اُن سے کرتا ہوں۔ اُن کے ساتھ کھانے بیٹھتا ہوں تو کھانا زہر ہو جاتا ہے۔ بات کرتا ہوں تو خواہش ہوتی ہے کہ ایسی کھری کھری سناؤں کہ ان کی طبیعت تلملا اُٹھے۔"

یہ سن کر انورادھا حیرت میں پڑ گئی۔ کسی طرح بیچ میں ٹوکا۔ "انوپم تو کیا کہہ رہا ہے؟ پاگل ہو گیا ہے کیا؟ نہ بیٹا یہ سب نہیں سوچنا چاہئے۔ ایسا کہنا بہت بڑا گناہ ہے۔"

اسی شام شوہر کو ششماہی کا نتیجہ دکھاتے ہوئے اس نے کہا "ماسٹر نے کسی بات پر چڑھ کر فیل کر دیا۔ پرچے تو اس نے بہت اچھے کئے تھے۔"

کانتی چرن بگڑ کر بولے۔ "جب کسی بات کو سمجھا نہ کرو تو بیکار ٹانگ مت اڑایا کرو۔ ماسٹر بیچارہ کیا کرے گا جب آپ کے صاحبزادے کتاب کو ہاتھ نہ لگائیں گے۔ کتنی شرم کی بات

ہے میری پانی کا پیان اٹھا کر دیکھ لو۔ آج تک کسی ٹیسٹ میں بھی فیل نہیں ہوا۔ ان نواب صاحب کا ابھی سے یہ حال ہے۔"

کالی چرن کو بیٹے کی ناکامی پر سچ مچ افسوس ہوا۔ انھیں لگا کہ ضرور اس کے پڑھنے لکھنے کے ڈھنگ میں کوئی ہے ورنہ ششماہی میں فیل کیوں ہوتا۔ وہ اسے سدھارنے کی غرض سے جاسوس کی طرح اس کے پیچھے لگ گئے۔ وہ اخبار پڑھتا تو اسے سنا کر طنز کرتے۔ "واہ علم سیاسیات پڑھ رہے ہیں!" وہ دوستوں کے ساتھ ہنستا بولتا گھومنے جاتا، سنیما دیکھتا تو ڈانٹتے۔ "اس طرح رنگ رلیاں مناکر پاس ہوگے؟ علم بڑے ایثار سے آتا ہے۔ بابو صاحب! کافی ہاؤس اور سنیما جاکر پنڈت نہیں ہو جاؤ گے! نہ پڑھنا نہ لکھنا بس یہاں گئے وہاں گئے! یہی رنگ ڈھنگ رہے تو زندگی بھر اپنی قسمت کو روؤ گے۔"

کالی چرن خود ایک غریب کلرک کے چوتھے لڑکے تھے۔ ساری پڑھائی وظیفہ اور ٹیوشن کے بل پر پار کی۔ باپ بہت چڑچڑے اور سخت مزاج تھے۔ ماں بھی بالکل اُن کی ہی طرح تھیں اس لئے گھر میں خوشی اور محبت کی بات کبھی سنائی نہیں پڑتی تھی۔ صرف سنائی پڑتا تھا طنز، گالیاں، لڑائی اور تکرار۔ اس ماحول میں کالی چرن کے مزاج کی ساری شگفتگی لٹ گئی تھی۔ وہ سیدھی بات بھی اُلٹے ڈھنگ سے کرتے تھے۔ اگر انھیں چائے پینے کی خواہش ہوتی تو وہ چائے بنانے کو نہ کہہ کر یہ پوچھتے۔

"اس گھر میں ایک پیالی چائے بھی نصیب نہیں ہوگی؟ جائیں کسی ہوٹل میں جاکر پی آئیں۔"

ان کے دل میں اگر کسی کی محبت کبھی ہوتی تو بھی یکایک وہ اس سے اس طرح بدل جاتے کہ تعجب ہوتا۔ کچھ ایسا انوپم کے ساتھ بھی ہوا۔ انوپم باپ کا سایہ دیکھ کر ہی نفرت اور غصے سے بھر جاتا۔ باپ بھی بیٹے کو سامنے پاکر طنز کے تیر و نشتر سنبھال لیتے۔

"کسی طرح وہ دن بھی گزر گئے۔" انورادھا نے ٹھنڈی سانس لی۔

کالی چرن سگریٹ خرید کر واپس آ گئے تھے۔ انھوں نے سگریٹ کیس صاف کرتے ہوئے کہا۔ "انوپم کی ماں! جس دن انوپم گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا اُس دن مجھے بھی بہت افسوس ہوا تھا۔ غصہ بھی آیا تھا مگر میں رویا نہیں تھا۔ آج تو بار بار آنکھیں بھر آتی ہیں۔ بس جی چاہتا ہے خوب چلا چلا کر رو دوں۔"

انورادھا نے محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر کہا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو! آج کے دن تم باجا بجواؤ، دیے سجاؤ۔ محلے بھر میں مٹھائی تقسیم کراؤ۔ تمہیں تو بیٹا، بہو، پوتا... سب ایک ساتھ مل رہے ہیں۔ کوئی تم سے خوش قسمت بھی تو ہو۔"

"اب میری مونچھوں کی شامت آجائے گی۔" کالی چرن کو اپنی باہیں ابھی سے بھری بھری لگنے لگیں۔

شام ہوئی۔ خیر مقدم کی تیاری پوری ہونے کو نہیں آرہی تھی سارا گھر خوشی سے جگمگا رہا تھا۔

انوپم کو جو کچھ پسند تھا وہی کھانا بھی تیار ہوا۔ لڑکوں نے لاکھ کہنے پر بھی کھانا نہیں کھایا۔ نوکرانی آکر لوٹ گئی۔ جاڑے کی وجہ سے لڑکوں کو اسٹیشن جانے سے روکا مگر کوئی بھی نہ مانا۔ آج ان کی یہ ضد ماں باپ دونوں کو اچھی لگ رہی تھی۔ آج کالی چرن نے سب کو من مانی کرنے کی چھوٹ دے رکھی تھی۔

گاڑی ٹھیک وقت سے اسٹیشن پر آگئی۔ کالی چرن کانپتے پیروں سے جلدی جلدی بیٹے کو ڈھونڈنے لگے۔ دوسری طرف انورادھا اور بچوں کی نظریں ان کا پیچھا کر رہی تھیں۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے سے وہ لوگ اُترے۔ ماں نے بیٹے کو دور سے ہی پہچان لیا۔ وہ اُدھر لپکی۔ کالی چرن نے بھی انھیں دیکھ لیا تھا۔ پاس آکر گلے لگاتے ہوئے پوچھا۔ "اچھے ہو نا؟"

انورادھا نے انوپم کو باہوں میں بھر کے اس طرح چپکا لیا جیسے وہ ننھا سا بچہ ہو۔ کچھ کہتے نہ بنا۔ آنسو گالوں پر لڑھک آئے۔ خوشی کے آنسو۔ بچے پاس کھڑے بھیا بھابھی کو دیکھ رہے تھے۔ ہونے ہاتھ جوڑے۔ کلیانی نے موقع پاتے ہی بھتیجے کی طرف باہیں پھیلا دیں۔ وہ خوش ہوتا ہوا ماں کی گود سے کود پڑا۔ امول اور وکاس چٹکی بجا بجا کر اُس کا دھیان اپنی طرف متوجہ کرنے لگے۔

انوپم نے ایک بار اچٹتی ہوئی سونی سونی نظر اپنوں پر ڈالی اور سامان گن کر قلیوں سے کہا۔ "سنبھال کر اٹھانا، عمدہ چمڑے کے بیگ ہیں۔"

قلی سامان لے کر آگے بڑھے۔ انورادھا نے پوتے کو لیا۔ کلیانی بھابھی سے بات کرتی ہوئی سٹ کر چلنے لگی۔ ریشمی جارجٹ کی گلابی کامدار ساڑھی۔ کالے رنگ کا کوٹ، ہاتھوں میں ڈھیر سی سونے کی چوڑیاں، انگوٹھیاں، گلے میں ایکدم نئے ڈھنگ کا ہار، کانوں میں بڑی بڑی بالیاں۔ کندھوں پر بکھرے ہوئے کٹے ہوئے بال۔ ہونٹوں پر گہری لپ اسٹک اور چہرے پر روکھا غیریت کا سا انداز۔

"اماں! یہ تو کتنا پیارا سا ہے۔ اسے میں کل اپنے اسکول لے جاؤں گی۔"

ماں ہنسی۔ "بھابھی کو بھی لے جانا۔ یہ بھی تو پیاری سی ہیں۔"

انوپم کو گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ وہ سب سے آگے ہو گیا۔ دل میں چھپے ہوئے تلخ الفاظ ہونٹوں پر آنے کے لئے مچلنے لگے۔ اس نے قلیوں کو ویٹنگ روم میں رُکنے کا حکم دیا۔ سب ٹھٹھک گئے۔ وہاں کیوں؟

"بس تھوڑا ہی وقت لوں گا۔" انوپم نے کالی چرن سے کہا۔ کمرہ خالی پڑا تھا۔ اس نے قلیوں کو پیسے دے کر باہر کر دیا۔ اٹیچی کیس بیچ کی میز پر رکھ کر کھولتے ہوئے اُس نے سرد لہجے میں باپ سے پوچھا۔ "اور سنائیے کیا حال چال ہے؟ بچے تینوں زندہ ہیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا۔ آپ کی مہربانیاں ان پر بھی تو رہتی ہوں گی ہے"

کالی چرن کو یہ لہجہ انجانا سا معلوم ہوا۔ بات کا تیور نہ سمجھتے ہوئے وہ ہکا بکا ہو کر اسے دیکھتے رہے کچھ

بوڑے نہیں۔ یہ نہیں کہ وہ اس بغاوت سے انجان تھے۔ خاموش رہ کر دو چار الفاظ میں بھی وہ اسے چوٹ پہنچا سکتا تھا اس کا تجربہ انھیں تھا۔ مگر اس وقت اس کے لہجے نے انھیں تعجب میں ڈال دیا۔ انورادھا کو بھی لگا کہ جیسے وہ نوجوان اس کا انوپم نہیں کوئی اور ہے۔ خلوص، محبت، تمنا کچھ بھی نہیں۔

ایک عجیب غرور کا انداز انوپم کے چہرے پر جھلکنے لگا جیسے ماں باپ کو کامیابی سے چونکا کر اور انھیں چوٹ پہنچا کر اسے سکون نصیب ہوا ہو۔ اس نے پھر طنز کیا۔ "کپوت جب کچھ کر کے دکھا دیتے ہیں تو گھر والوں کو بہت صدمہ پہنچتا ہے مگر کیا کیا جائے؟ مجھے آپ کے ساتھ پوری پوری ہمدردی ہے۔ یہ دیکھئے۔" اس نے بینک کی پاس بک اس کے سامنے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "پینتیس ہزار نقد ہے۔ دیکھ لیجئے ورنہ پھر بعد میں مجھے جھوٹا سمجھئے گا۔ میری بیوی کے بدن پر جو گہنے ہیں وہ سب اصلی سونے کے ہیں، گلٹ کے نہیں! تنخواہ اور منافع ملا کر کل آٹھ نو سو روپے پڑ جاتا ہے۔ گزارے کے لئے کافی ہے۔ ویسے آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس نکمے نے اتنا سب کچھ ہتھیا کیسے لیا! سب قسمت کا کھیل ہے۔ آپ نے مٹانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی مگر بنانے والا آپ کی خواہش تو دیکھتا نہیں، اپنی ہی سی کرتا ہے!"

"تم یہ سب کیا بک رہے ہو؟ میں تمہیں مٹانا چاہوں گا۔" ٹوٹے لہجے میں کالی چرن بولے۔ ان کے چہرے پر بے عزتی کا غم اور جھلاہٹ نمودار ہوگئی۔ آنکھیں پھیل گئیں اور ہونٹ کانپنے لگے۔ انھوں نے دھیان سے اس کی طرف دیکھا۔ کہاں؟ کچھ بھی تو نہیں بدلا ہے اس میں۔ پرانی تلخ یادیں ذہن کے دریچوں میں راستہ بنانے لگیں۔ ایک دن انھیں دفتر جانے میں بہت دیر ہوگئی تھی۔ انھوں نے انوپم سے پوچھا۔ "بیٹا تمہیں کوئی خاص کام نہ ہو تو تمہاری سائیکل پر چلا جاؤں، بہت دیر ہو چکی ہے۔ رکشہ کے چکر میں پیسے بھی بیکار خرچ ہوں گے اور وقت بھی لگ جائے گا۔"

سائیکل انھوں نے ہی خرید کر انوپم کو دی تھی۔ نام کے مالک بھی وہی تھے مگر جواب ملا۔

"مجھے ایک گھنٹہ بعد کالج جانا ہے۔ ویسے چیز آپ کی ہے اس لئے میری سہولت اور پریشانی کا کیا سوال؟ اگر آپ روز اس پر دفتر جانا شروع کر دیں تب بھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" وہ پیدل ہی چلے گئے تھے۔

انھیں جاڑے کر تیز بخار چڑھا تھا اور درد کے مارے سر پھٹا جا رہا تھا۔ انوپم کو پکار کر انھوں نے کہا۔ "ذرا جلدی سے ڈاکٹر کو بلا لاؤ، بڑی تکلیف ہے۔" اس نے بغیر کسی ہمدردی کے روکھے الفاظ میں صلاح دی تھی۔ "کیا کیجئے گا۔ بیکار روپے خرچ کر کے۔ خود ہی تو کہتے ہیں کہ تنگی ہے اور خود ہی ذرا سے بخار سے گھبرا کر ڈاکٹر کو گھر پہ بلا رہے ہیں۔"

بخار بڑھتا ہی گیا۔ گھبراہٹ میں کالی چرن کو موت کا دھیان آنے لگا۔ ایک دن انھوں نے انورادھا کو پاس بلا کر کہا۔ "میری خواہش ہے کہ میری موت کے بعد آخری سنسکار کافی آن بان سے ہو۔ انوپم کو سمجھا دینا کہ اگر بھگوان کی یہی مرضی ہو اور میں نہ رہوں تو سب کام ٹھیک سے کر دے۔" ماں سے یہ سن کر انوپم نے جو کچھ کہا تھا اسے سن کر بیمار باپ کانپ اٹھا تھا۔

"پہلے مریں تو کسی طرح! ابھی تو برسوں ہم لوگوں کے سینے پہ مونگ دلیں گے۔ مرنے کی باتیں کہہ کہہ کر ڈراتے ہیں!"

انوراُدھا نے بہت بگڑ کر ڈانٹا تھا "بھگوان نہ کرے کبھی ہم لوگوں کو تمہارا دیا کھانا پڑے۔ ابھی تو وہ اپنی روٹی کے لئے تمہارے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے ہیں پھر تمہاری آنکھوں میں کیوں کھٹکتے ہیں؟"

وہ بات اور اس کا نشتر اس کے دل سے نکالے نہیں نکلی تھی۔ آج بھی اس کا وہی لہجہ ہے، وہی مزاج اور وہی خیالات ہیں۔

انوراُدھا کو لگا جیسے اس کے سینے میں کچھ چبھا اور اندر ہی اندر ٹوٹ گیا۔

"بیٹا!" اس نے بھیگتے لہجے میں اپنے کھوئے لڑکے کو پکارا۔ "بیٹا انو!"

تینوں بچے سہم کر پاس پاس کھڑے ہو گئے۔ بہو نے ساس کی گود سے بیٹے کو لے لیا اور ایک آرام کرسی پر بیٹھ کر اُسے سُلانے لگی۔ جیسے وہ کوئی اور مسافر ہو۔ اور ان سب سے اس کا کوئی رشتہ نہ ہو۔ اپنی بات کا اپنی خواہش کے مطابق اثر ہوتے دیکھ کر انوپم نے اور بھی کڑوے لہجے میں کہا۔ "جو کچھ میں نے پایا ہے اس کے لئے میں نے برداشت بھی بہت کیا ہے۔ دن کو دن نہیں سمجھا، رات کو رات نہیں جانا۔ دولت حاصل کرنے کے لئے جائز و ناجائز دونوں طریقے اپنائے۔ آپ کا تو شاید ناجائز طریقوں پر اعتقاد نہیں ہے، سادھو جو ٹھہرے۔ ہم سے یہ سب باتیں کہاں نبھتی تھیں۔ میں نے تو رُتبے اور پیسوں کے لئے اچھے بُرے سب لوگوں کے تلوے چاٹے، صرف اس لئے کہ ایک دن آپ کے سامنے سر اُٹھا کر آپ کو نیچا دکھا سکوں۔ آپ یہ بات ٹھیک سے جان لیجئے کہ مجھے یہاں آپ لوگوں کی محبت کھینچ کر نہیں لائی ہے بلکہ زہریلی نفرت نے یہاں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ جب سے بڑا ہوا آپ سے طنز، بے عزتی اور رُسوائی ہی ملی۔ اُدھر مت بیٹھو، اِدھر مت جاؤ، یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔ ہر کام اور ہر بات کے لئے مجھے آپ کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔ باہر کی دنیا سے ہم لوگوں کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ گھر میں جیسے صرف آپ تھے۔ ہم سب پر حاوی۔"

پتھر کی تراشی مورت کی طرح کالی چرن کھڑے تھے۔ بالکل خاموش اور ساکت۔

"انوپم ہم لوگ بُرے ہیں، لاکھ غیر ہیں پھر بھی . . . ."

"پھر بھی کچھ نہیں ماں! اس ایک دن کے لئے میں نے بہت تکلیف اُٹھائی ہے۔ جو کچھ کہنا ہے مجھے کہہ لینے دو۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن میں اپنے چار پانچ دوستوں کو بڑے شوق سے چائے پلانے گھر لے آیا تھا۔ آپ اس دن دفتر سے بہت چڑھے ہوئے لوٹے تھے اس لئے آتے ہی نادر شاہی فرمان جاری کر دیا کہ لڑکے تو روز ہی آتے رہتے ہیں۔ ان سبھوں کا کام ہی کیا ہے؟ صرف چار بھجوا دو۔ میری بدقسمتی کہ چار اپنے کمرے میں لے جاتے وقت آپ کا چشمہ نہ جانے کیسے چھو گیا اور گر کر چٹک گیا۔ آپ جانتے تھے کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا پھر بھی سب دوستوں کے سامنے آپ نے بُری طرح مجھے پھٹکارا کہ میں اُن کے سامنے سر نہ اُٹھا سکا! اور بتاؤں؟ یہ سب باتیں مجھے ٹھیک اسی طرح یاد ہیں جیسے کل کے واقعات ہوں۔ صبح کا وقت تھا۔ آپ نہانے جا رہے تھے کہ اچانک دودھ والے نے آواز دی۔ آپ نے مجھے جگا کر لوٹا ہاتھ میں تھما دیا اور دو سیر دودھ لانے کو کہہ کر چلے گئے۔ نیند کے جھونکے میں لوٹا لئے پھر سو گیا۔ اُدھر گوالے نے کہرام مچا دیا کہ اُسے گھنٹہ بھر ہو گیا ہے مگر کوئی دودھ لینے نہیں آتا ہے۔ ماں رسوئی سے باہر آئی مگر تب تک آپ دھوتی لپیٹ کر غصّے سے غسلخانے سے باہر چلے آئے۔ میں آرام سے لیٹے رہا تھا۔ آپ نے مجھے بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔ میں ڈر کے مارے چپ چاپ سوچتا رہا کہ اچانک یہ کیا ہو گیا ہے؟ ایک دن کی بات نہیں تھی روز روز کا قصّہ تھا۔"

انو رآدھا جو آج تک لڑکے کی وجہ سے شوہر کو ہمیشہ مجرم قرار دیتی تھی اس وقت خاموش نہ رہ سکی۔ کانپتے ہوئے لہجے میں اس نے پوچھا۔ "بیٹا! باپ کے عیوب تو گنا ڈالے یہ تو بڑا اچھا کیا! لیکن وہ رات شاید تمہیں یاد نہیں ہے جب ایک گاؤں کے گھر میں تم بیہوش پڑے تھے اور کوئی سواری نہ مل سکنے کی وجہ سے تمہارے باپ پیدل بارہ میل بھاگتے ہوئے ڈاکٹر کو بلانے گئے تھے۔ یہ بھی تم بھول گئے ہو گے کہ ایک بار تمہیں سائیکل خریدنے کی خواہش پیدا ہوئی تو اُسے پورا کرنے میں انھیں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی جب کہ اس کی وجہ سے سالوں انھیں پیدل جانا پڑا تھا۔ ہاں میں جانتی ہوں۔ تم سب سے اور اپنے ملنے والوں سے بھی انھوں نے کہا تھا کہ پیٹ کی تکلیف کی وجہ سے ڈاکٹر نے پیدل چلنا بتایا ہے۔ جب بات کرنی ہے تو دھرم لگتی کرتے۔ اس طرح بیچ بازار میں باپ کی عزت اُتار کر تمہیں کیا مل گیا ؟"

انوپم نے ماں کو تیکھی نظروں سے گھورتے ہوئے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔ "تم بھلا باپ کی طرف داری نہ کرو یہ کیسے ممکن ہے؟ ہمیشہ سے ان کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی ہو۔ ان کی چاپلوسی کر کے انھیں خوش کرتی رہی ہو اور جھوٹے وعدوں سے مجھے بہلاتی رہی ہو۔"

کالی چرن جیسے یکایک نیند سے جاگے۔ ایک بار سر سے پیر تک انوپم کو دیکھا اور بولے۔ "اور کہو سپوت! ایسا موقع بار بار نہیں آئیگا۔"

"جی ہاں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ کیونکہ تین گھنٹہ بعد ہم لوگ کلکتہ واپس چلے جائیں گے اور اس کے بعد بھگوان نہ کرے ایسا موقع پھر آئے۔"

کالی چرن کو لگا جیسے وہ غصے سے پاگل ہو جائیں گے۔ جلتی ہوئی نظر بہو اور بیٹے پر ڈال کر انو رآدھا کا ہاتھ پکڑ کر باہر لاتے ہوئے انھوں نے بھرآئے ہوئے لہجے میں کہا۔ "چلو! ابھی کچھ اور سننا باقی ہے ؟"

ماں نے مڑ کر ہمیشہ کے لئے بچھڑتے ہوئے بیٹے کو دیکھنا چاہا مگر اس کا دھندلا چہرہ ایک بار اُبھر کر آنسوؤں میں ڈوب گیا۔

کلیانی نے نیند میں مسکراتے ہوئے بھتیجے کا منہ چوم لیا اور اپنی بے ڈول گڑیا جلدی سے اس کے ہاتھوں میں دبا کر دھیرے سے بھابھی سے بولی۔ "میں نے پپّو کے لئے بنائی تھی۔"

ایک ایک کر کے سب باہر چلے گئے۔ وکاس سب سے پیچھے تھا۔ چند سکنڈ کے لئے وہ دروازے پر ٹھٹھکا پھر دوڑتا ہوا آکر بھائی سے لپٹ گیا اور سسکتا ہوا بھائی سے کہنے لگا۔ "بھیا! ہم سے آپ بولے کیوں نہیں ؟"

انوپم اب بھی ہاتھ میں پاس بک لئے بے سُدھ سا کھڑا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اچانک پاس بک پر لکھی ہوئی سب گنتیاں بچپن میں سلیٹ پر لکھی ہوئی گنتیوں کی طرح بے معنی ہو گئی ہیں؟ جس دیوار کو اتنے برسوں کی کڑی محنت سے اس نے اپنے چاروں طرف کھڑا کیا تھا وہ اب کھوجنے پر بھی نہیں مل پا رہی تھی۔

اس نے پاس کھڑے وکاس کو محبت کی متلاشی آنکھوں سے دیکھا اور گلے سے لگا لیا۔ پیشانی کی لکیریں اور گہری ہوتی گئیں۔ دانتوں کے نشان نچلے ہونٹ پر مچلنے لگے۔ بھرآئے ہوئے لہجے میں اُس نے پوچھا۔ "بھائی رے! سچ کہو کیا گھر پر سب لوگ مجھے یاد کرتے تھے ؟" جواب میں ننھی ننھی باہوں نے اسے جکڑ لیا۔

ایک ٹوٹی کرسی کے ہتھے پر پڑے گیندے کے دو ہار ہوا میں جھول رہے تھے۔ کلیانی کی گڑیا پپّو کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین میں گر گئی۔

۱۸۸۶ء سے

مشہور

قابلِ اعتماد

اور

ممتاز دواخانہ

شودھی چھوٹی ہریں
پیٹ کی جملہ شکایت کے لئے!

عرقِ انگور مرکب
دماغی وجسمانی کمزوریوں کے لئے!

بال امرت گھٹی
دودھ پیتے بچوں کے دودھ ہضم کرنے کے لئے!

کرشن کا بال امرت
بچوں کی میٹھی پشٹی!

لال تیل
بچوں کے سوکھا و مٹھوا روگوں میں ملنے کے لئے!

جہاں تمام دوائیں اعلیٰ قسم کی تروتازہ اور خالص جڑی بوٹیوں سے تیار کی جاتی ہیں جنہیں بچے بوڑھے و جوان ہر عمر کے لوگ بغیر کسی خوف کے پورے اعتماد کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں آپ بھی اپنی تکلیفوں کو دور کرنے اور مکمل صحت پانے کیلئے مندرجہ ذیل پتہ سے دوائیں منگائیں اور استعمال کریں۔



اعتماد کا نشان

حکیم رام کشن لال
یونانی میڈیکل ہال، رانی منڈی الہ آباد


KARKHANA DARUSSEHAT
KDS
REGISTERED
QUDRATI
TEL
قدرتی تیل
INDICATIONS
PAIN IN JOINTS AND
MUSCLES, SPRAIN,
SWELLING, CUTS & BURNS
TRADE MARK
ESTD 1903
KARKHANA
DARUSSEHAT (REGD)
MAUNATH BHANJAN, U.P.
جہاں گیا
چھا گیا
قدرتی تیل
درد ، زخم ، چوٹ
موچ ، کٹنے اور
جلنے پر
مفید
ہے
کارخانہ دارالصحت قائم شدہ ۱۹۰۳ء مئوناتھ بھنجن ، یوپی


سفر میں
بڑا ہی
مزا آئیگا
چنیدہ طاقت سے بھرپور
اجزا سے بنائی ہوئی
جے۔ بی۔ منگھارام کی
مٹھائیاں اور بسکٹ آپ کے
سفر میں بے حد دلکشی اور مزا پیدا کریں گے
جے۔ بی۔ منگھارام کے
بسکٹ
لگ بھگ سبھی
ریسٹورنٹ
اور کینٹین بیچتے ہیں
جے۔ بی۔
منگھارام اینڈ کمپنی
گولکنڈہ حیدرآباد

FASANA (URDU MONTHLY) VOL. II—1967
ALLAHABAD. Price Rs. 1/- Regd. No. L—420
Registered with the Rgistrar of Newspaers for India at No. 9775/64